میرا بھائی

میرا بھائی

فاطمہ جناح

کاٹھیاواڑ سے کراچی تک

انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں برطانوی راج کا سورج انتہائی تیزی سے طلوع ہونا شروع ہوگیا تھا۔ برصغیر ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے زندگی شروع کرنے والے برطانوی تاجر جو کل تک ہندوستانی حکمرانوں سے مراعات، دوستی اور ہمدردانہ سلوک کی بھیک مانگا کرتے تھے۔ برصغیر ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں آچکی تھی۔اب یہ رویہ بدل چکا تھا اور وہ ہندوستان میں ایک ایسی حکومت قائم کر چکے تھے جو برطانوی تاج شاہی میں ایک جگمگاتے ہوئے ہیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلکہ حالات میں بظاہر خاموشی تھی۔مگر یہ خاموشی ایک بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھی۔فرنگی حکمرانوں کو یقین تھا کہ انہوں نے ہندوستان کے رہنے والوں کو مہذب بنانے کے لئے جو کوششیں کی تھیں، اس سے ناراض ہندوستانیوں کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہوگا اور تاج برطانیہ کی عوام دوست پالیسی نے مقامی لوگوں کے دلوں سے انگریزوں سے نفرت اور سرکشی کے جذبات ختم کر دیئے

تھے۔انگریز حکمران ہندوستانیوں کے دلوں میں اندر ہی اندر کھولنے والے لاوے سے یکسر بے خبر تھے۔1857ء کی جنگ آزادی انگریزوں کے خلاف ایک سخت ردعمل تھی۔یہ بغاوت جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔یہاں تک کہ یہ واقعہ انگریز حکمرانوں کے خلاف ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی طویل کتاب کے پہلے باب کی حیثیت اختیار کر گیا۔اس جنگ آزادی میں کئی لوگوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ہندوستان کو آزاد کرنے کیلئے اس جنگ میں جانیں قربان کرنے والے سب لوگوں کو شہداء کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔اس واقعہ نے ہماری قوم کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کئے اور پورا ہندوستان متاثر ہوا،اس کے باوجود ہندوستان میں کچھ علاقے ایسے بھی تھے جہاں اس کشیدہ صورتحال میں بھی زندگی پرامن اور پرسکون رہی اور وہ اردگرد ہونے والی سنگین صورتحال سے بے نیاز رہے۔کاٹھیاواڑ کی شاہی ریاست گونڈل ایک ایسا ہی علاقہ تھا جو ممبی پریذیڈینسی کے ماتحت تھا۔تاج برطانیہ سے وفاداری کے طفیل ٹھاکر صاحب آف گونڈل کی حکمرانی پورے آب وتاب کے ساتھ قائم تھی۔ ٹھاکر صاحب جانتے تھے کہ اپنی ریاست کو برطانیہ کے خلاف سرگرمیوں سے علیحدہ رکھنا ان کے اپنے مفاد میں تھا۔انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ انہیں ریاستی حکمرانی سےمحروم نہ کردیا جائے۔ ٹھاکر صاحب کی حکومت میں گونڈل ریاست کے لوگ اپنی زندگی کے معمولات میں مشغول تھے۔وہ اس سیاسی جدوجہد سے بالکل متاثر نہ ہوئے،جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

ریاست گونڈل کی معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔نمایاں فصلوں میں کپاس، گندم، جوار اور باجرہ شامل تھیں۔زرعی پیداوار میں جس چیز نے گونڈل کو خاص شہرت عطا کی تھی۔وہ یہاں کی مرچ تھی حتیٰ کہ آج بھی گونڈل کی مرچیں مشہور ہیں۔ہمارے گھر میں میرے شعور کے

ابتدائی دنوں ہیسے تمام کھانوں میں ہمیشہ مرچوں کا خوب چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ ہم میں سے جس کسی کو کھانے کا ذائقہ اپنے مزاج کے مطابق محسوس نہ ہوتا تو وہ ایک پلیٹ میں سے اپنے کھانے میں مزید مرچیں ڈال لیتا تھا۔ مرچوں سے بھری ہوئی پلیٹ ہمیشہ کھانے کی میز پر پڑی رہتی تھی۔

دارالحکومت ہونے کی وجہ سے گونڈل ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر ریاست کی زیادہ تر آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی جو سادہ اور مطمئن زندگی گذار رہی تھی۔ ان لوگوں کی دنیا چھوٹی اور مختصر سی تھی۔ جس کی سرحدیں اس ریاست کی جغرافیائی حدود کے اندر ہی سمٹی ہوئی تھیں۔

ریاست کے دوسرے بہت سے دیہات کی طرح پانیلی بھی ایک ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ 1857ء کے قریب جب جنگِ آزادی کے ذریعے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف منظم سیاسی اپوزیشن کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ اس زمانے میں پانیلی کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس گاؤں میں میرے دادا پونجا رہتے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد یہیں پیدا اور فوت ہوئے تھے۔ میرے دادا پانیلی کے ان چند لوگوں میں سے تھے جو زراعت پیشہ نہیں تھے۔ ان کی کچھ دستی کھڈیاں تھیں جن وہ خود کاریگروں کے ہمراہ طویل اور تھکا دینے والے اوقات میں کام کیا کرتے تھے۔ اس مشقت کے نتیجے میں وہ ہاتھ کا بنا ہوا خام کپڑا تیار کیا کرتے تھے جس کی فروخت سے انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ ان کے خاندان کا شمار اس چھوٹے سے گاؤں کے خوشحال گھرانوں میں کیا جاتا تھا۔

ان کے تین بیٹے تھے۔ والجی، ناتھو اور جناح۔ موخرالذکر ان کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ان کی ایک بیٹی تھی جس کا نام مان بائی تھا۔ جناح اپنے دونوں بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ فعال اور ارادے کے پکے تھے۔ وہ 1857ء کے تاریخی سال کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

جس کے دوران آزادی کی پہلی ہندوستانی بغاوت برپا ہوئی۔ ان کے نوجوان اور بلند نظر ذہن کو پانیلی نہ صرف ایک سست رو اور خوابیدہ گاؤں معلوم ہوتا تھا، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایسی جگہ تھی جہاں زندگی محض ایک چھوٹے سے بازار اور گاؤں کے کنویں پر ہونے والی گپ شپ کے گرد گھومتی تھی۔ انہوں نے سنا تھا کہ گونڈل ایک بڑا شہر ہے جہاں زندگی زیادہ فعال ہے اور کاروبار بھی وسیع ہے۔ پانیلی میں رہ کر وہ بھلا کیا کر سکتے ہیں؟ دونوں بڑے بھائیوں کے ساتھ مل کر خاندانی کھڈیوں پر کام کرنے میں ان کے لئے کوئی کشش نہیں تھی۔ یہ بہت چھوٹا سا کاروبار تھا۔ ان کی نظریں بڑے شہر پر لگی ہوئی تھیں، جہاں ان کی مہم جو یانہ طبع کو تسکین مل سکتی تھی۔

ان کے والد نے کاروبار کے لئے انہیں نقدی تو کم ہی دی۔ مگر نصیحت خوب کی کہ کسی بھی کاروبار میں سرمایہ لگانے سے پہلے تفصیل سے جائزہ لینا چاہئے کہ انہیں کس کاروبار میں جانا چاہئے۔ تجزیہ پسند اور محتاط ذہن کے ساتھ تھوڑی پونجی کے مالک ہونے کے باعث میرے والد جلد بازی میں کوئی کاروبار شروع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ تاہم انہیں بعض ایسے کاروبار تلاش کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا جن میں وہ جلدی جلدی خرید وفروخت کر سکتے تھے۔ کاروبار سے متعلق ان کی سوجھ بوجھ اور سخت محنت کے باعث انہوں نے جلد ہی کافی منافع کما لیا۔ یوں ان کے اصل سرمائے میں اضافہ ہو گیا۔ چند ماہ بعد وہ جب گونڈل سے پانیلی واپس آئے تو ان کے والد یہ دیکھ کر خوش ہوئے کہ ایک بڑے شہر میں ان کے بیٹے نے منافع بخش کاروبار شروع کیا ہے، زندگی کی پرانی اقدار پر یقین رکھنے کے باعث انہیں اندیشہ تھا کہ گونڈل جیسے بڑے شہر کی مختلف ترغیبات اور چکا چوند ان کے نوجوان بیٹے کی توجہ اس منافع بخش کاروبار سے ہٹا سکتی ہیں، جسے اس نے نہایت مختصر عرصے کے دوران کامیابی سے منظم کیا ہے۔ اس کے علاوہ میرے دادا کی عمر بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے دونوں بڑے بیٹوں اور بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔

والدین کی واحد ذمہ داری اب یہ باقی رہ گئی تھی کہ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی کسی اچھی سی لڑکی کے ساتھ ہو جائے جس کا تعلق خود ان کے خوجہ فرقے سے ہو یا کسی دوسرے اچھے خاندان سے۔

چنانچہ میرے والد کے لئے مناسب رشتے کی تلاش شروع کر دی گئی۔ میرے دادا میرے والد کے پانیلی چھوڑ کر گونڈل میں ایک نئی زندگی کا مستقل آغاز کرنے سے قبل ہی ان کی شادی کر دینا چاہتے تھے۔ رشتے کی تلاش میں وہ پانیلی سے باہر نکل گئے اور وہاں سے تقریباً دس میل کے فاصلے واقع دھافہ نامی گاؤں میں جا پہنچے، انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایک معزز گھرانے کی لڑکی میٹھی بائی ان کے بیٹے کے لئے موزوں دلہن ثابت ہوگی۔ رشتے طے کرانے والوں کی معرفت لڑکی کے والدین سے رابطہ قائم کیا گیا۔ وہ لوگ رشتہ کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس طرح میرے والد جناح اور میری والدہ میٹھ بائی کی شادی دھافہ میں 1874ء کے لگ بھگ انجام پائی۔

میرے والد کا کاروبار پھیلتا گیا۔ اور وہ اپنے مستقبل کے بارے میں کافی پراعتماد ہوتے گئے۔ تاہم ان کی رگوں میں سخت محنت کرنے اور مزید بڑا کاروبار کرنے کی خواہش بدستور موجود رہی، انہوں نے جس راستے کا بھی انتخاب کیا، اس پر آگے بڑھنے کیلئے سخت جانفشانی سے کام کیا۔ سستی، کاہلی اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہنے کو وہ اپنی راہ کی رکاوٹیں گردانتے تھے۔ فرض سے سچی لگن اور طویل اور سخت محنت کو وہ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کی قیمت تصور کرتے تھے جو بخوشی ادا کی جانی چاہیے۔ گونڈل انہیں اپنی خواہشوں اور پھیلے ہوئے خوابوں کی تکمیل کے لئے بہت چھوٹی سی جگہ محسوس ہونے لگی۔ وہ بمبئی جیسے بڑے شہر کے متعلق سن چکے تھے جو خوشحالی کا مسکن تھا اور جہاں کے کاروباری گھرانے بے تحاشا مال و دولت کے مالک تھے۔ وہ بمبئی سے

نسبتاً چھوٹے ایک دوسرے شہر کراچی کے بارے میں بھی حوصلہ افزاء خبریں سن چکے تھے جس نے گذشتہ چند برس کے دوران ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت حاصل کر لی تھی اور وہ تجارتی مرکز کی حیثیت سے بھی تیزی سے پھل پھول رہا تھا۔ انہوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ گونڈل کو چھوڑ کر اچھے مستقبل کی تلاش میں انہیں بمبئی جانا چاہئے یا کراچی۔ اگرچہ وسیع تر کاروباری مواقع انہیں بمبئی جانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ مگر تقدیر ان کے بارے میں اپنا فیصلہ سنا چکی تھی اور یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس کے نتیجے میں میرے والدین کاٹھیاواڑ سے کراچی منتقل ہو گئے۔

میرے والد نے اس سے پہلے کراچی جتنا بڑا شہر نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس وقت تک اس شہر کی شہرت کا باعث محض کھڈا ہی تھا۔ یہاں کشتیاں روزانہ تازہ مچھلی پکڑ کر لاتی تھیں جنہیں دھوپ میں کھلی جگہوں پر خشک کر کے مچھلی گوداموں میں ذخیرہ کر لیا جاتا تھا۔ یہ گودام ساحل کے ساتھ ساتھ بے ترتیبی سے قائم کئے گئے تھے۔ تب کھارادار محض چند لوگوں کے مجموعے کا نام تھا اور جیسا کہ اس کے نام سے واضح ہے یہاں بحیرہ عرب کا نمکین پانی سڑکوں اور گلی کوچوں تک میں آتا رہتا تھا۔ میٹھادر میں لیاری اور ملیر دریاؤں کا میٹھا پانی صرف گھٹنے کی گہرائی تک کنواں کھودنے پر نکل آیا کرتا تھا۔ صدر کے علاقے میں برطانوی فوجی دستے مقیم ہوا کرتے تھے اور ان کی کنٹونمنٹ اور بیرکس وہیں آباد تھیں۔ میرے والد نے دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان نیونہم روڈ کھارادر میں کرائے پر لے لیا۔ یہ علاقہ شہر کا کاروباری مرکز تھا۔ یہاں بہت کاروباری گھرانے آباد تھے اور ان میں سے بعض گجرات اور کاٹھیاواڑ سے آئے تھے۔

وہ عمارت جس میں ہمارا گھر تھا، چونے کے ساتھ پتھروں کی چنائی کر کے تعمیر کی گئی تھی اور اس کے فرش اور چھتیں لکڑی کے تختوں سے بنائی گئی تھیں۔ ہمارا اپارٹمنٹ پہلی منزل پر واقع تھا۔ جس میں لکڑی اور لوہے سے بنی ہوئی ایک کشادہ بالکونی بھی تھی جو باہر کی جانب سڑک کے اوپر

چھجے کا اضافہ کر کے بنائی گئی تھی۔ یہ بالکونی دن کے وقت بیٹھنے کے لئے ٹھنڈی اور ہوادار تھی اور رات کو اس میں ایک چارپائی بچھائی جا سکتی تھی۔ بالکونی اور دونوں کمروں کا رخ مغرب کی جانب تھا جو کراچی میں مکانوں کا بہترین رخ شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس جانب سے سمندر کی ٹھنڈی اور تیز ہوا سارا سال آتی رہتی ہے۔

نوجوان مسٹر جناح کو شروع شروع میں کسی اچھے منافع بخش کاروبار کی تلاش میں کافی مشکل ہوئی۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے کئی کاروباروں میں قسمت آزمائی کی اور پھر بتدریج ان کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ ان کی قسمت ان دنوں عروج پر تھی۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے، ان کے وارے نیارے ہو جاتے۔ اس زمانے میں کراچی میں کچھ برطانوی فرمیں تھیں جو کراچی اور دوسرے اندرونی علاقوں کی پیداوار یورپ اور مشرق بعید کے ملکوں کو برآمد کرتی تھیں۔ یہ فرمیں انگلینڈ سے روزمرہ استعمال کی چیزیں درآمد کرتی تھیں۔ گراہمز ٹریڈنگ کمپنی ایک ایسی ہی فرم تھی اور اس کا شمار کراچی میں درآمد برآمد کا کاروبار کرنے والے صف اول کے اداروں میں ہوتا تھا۔ میرے والد نے کسی سکول سے انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی مگر انہوں نے اپنی محنت اور فطری میلانِ طبع کے باعث روانی سے انگریزی میں بات کرنا سیکھ لیا تھا۔ اس زمانے میں اسے اچھا خاصا کمال سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ تب کراچی کے چند ایک تاجر ہی انگریزی میں بات چیت کرنے کے قابل تھے۔ شاید یہ ان کی انگریزی میں بات چیت کرنے کی قابلیت ہی تھی جس کے باعث وہ گراہمز اینڈ کمپنی کے جنرل منیجر کے کافی قریب آ گئے اور یہ تعلق ان کے کاروبار کی تیزی سے ترقی کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔

کئی برس بعد جب ہمارا گھرانہ کچھ عرصے کے لئے رتنا گیری میں مقیم تھا تو میرے والد مجھے اور میری دو بہنوں کو رات کے وقت انگریزی لکھنا پڑھنا سکھایا کرتے تھے۔ وہ ڈیپلن کی تختی

سے پابندی کرتے تھے اور ہمیں انگریزی پڑھنے کے اس گھنٹے کے دوران ایسا رویہ اختیار کرنا پڑتا تھا۔ گویا ہم سکول میں اپنے کلاس روم میں ہوں، ہم بچوں کو اپنے والد بہت بڑے آدمی نظر آتے رہتے۔ ایک ایسے بڑے آدمی جو نہایت اچھی انگریزی بول سکتے تھے۔ ہم ان پر رشک کیا کرتے تھے اور ہماری بڑی خواہش ہوتی تھی کہ ہم بھی ان کی طرح عمدہ انگریزی میں بات کرسکتیں۔ کبھی کبھی جب ہم تینوں بہنیں مل بیٹھتیں اور شرارت کے موڈ میں ہوتیں تو اپنے والد کی انگریزی کی نقل اتارا کرتیں۔ ہم میں سے ایک کہتی: اش فش، اش فش ایس اور دوسری جواب دیتی: اش فش، اش فش، نو، ہم یہ کھیل نہایت سنجیدگی سے کھیلا کرتیں اور جھوٹ موٹ یوں ظاہر کرتیں گویا اگر ہم پہلے ہی انگریزی پر عبور حاصل نہیں کر چکیں تو اسے سیکھنے کے مرحلے تک ضرور پہنچ چکی ہیں۔ ان دنوں قندھار سے بہت سے افغان تاجر کاروبار کے لئے آیا کرتے تھے۔ میرے والد کے ان لوگوں کے ساتھ بھی وسیع کاروباری سودے ہوا کرتے تھے۔ کئی برس تک ان کے ساتھ گفتگو کرتے رہنے سے میرے والد نے فارسی بولنے میں بھی کافی مہارت حاصل کرلی تھی۔ میں نے انہیں اکثر روانی سے فارسی زبان میں بات کرتے دیکھا۔ کاٹھیاواڑ سے تعلق رکھنے کے باعث ہمارے گھر میں گجراتی زبان بولی جاتی تھی مگر کراچی میں مقیم ہونے کے بعد ہمارے گھرانے کے افراد کچھی اور سندھی بھی روانی سے بولنے لگے۔

گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے ساتھ کاروباری تعلقات استوار ہو جانے کے بعد میرے والد نے دوسری کاروباری دلچسپیوں کے علاوہ مچھلی کے جیلاٹن اور گوند کا کاروبار شروع کرلیا۔ ان کے کاروباری تعلقات کئی ملکوں تک پھیل چکے تھے۔ جن میں انگلینڈ اور ہانگ کانگ خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ چونکہ ان ملکوں کے کاروباری اداروں کے ساتھ انگریزی میں خط و کتابت کرنا پڑتی تھی۔ لہٰذا میرے والد نے انگریزی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

ان دنوں کھارادر کے بعض کاروباری حضرات تجارت کے علاوہ بنکاری بھی کرتے تھے۔ سندھ بلوچستان اور پنجاب جیسے ساحل سے دور علاقوں کی تمام تر تجارت کراچی کی بندرگاہ سے ہوتی تھی اور بنکاری کی باقاعدہ اور موزوں سہولتوں کی عدم موجودگی میں رقوم کی منتقلی کا زیادہ تر کام کراچی کی انہی فرموں کے تعاون اور توسط سے انجام پاتا تھا۔ بہت سے گھرانے اپنی بچت کی رقوم بھی ان فرموں کے پاس جمع کروادیا کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج کل ہم لوگ بنکوں میں اپنا روپیہ رکھ دیتے ہیں۔ اگرچہ اس وقت ان فرموں کے ہاں بنکاری کا مکمل اور جدید ترین نظام موجود نہیں تھا۔ مگر یہ تاجر انتہائی دیانت دار ہوتے تھے اور ان کا زبانی وعدہ بھی سب سے بڑی یقین دہانی ہوا کرتا تھا۔ میرے والد کی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی بھی اس قسم کا ایک ادارہ تھی۔ جس کا کاروبار کافی وسیع تھا اور منافع بخش خطوط پر چل رہا تھا۔ اس فرم پر کاروباری طبقے اور عام لوگوں کو مکمل اعتماد تھا۔

میری والدہ امید سے تھیں اور میرے والد اپنی نوجوان بیوی کی پوری طرح دیکھ بھال کررہے تھے، دونوں میاں بیوی اپنے پہلے بچے کی ولادت کے بارے میں خاصے پرجوش اور مسرور تھے۔ اس وقت کراچی میں میٹرنٹی ہوم نام کی شاید ہی کوئی چیز تھی۔ بس چند ایک دائیاں تھیں۔ جن کی اپنے پیشے میں شہرت اچھی تھی۔ لہٰذا انہی کو چاروں طرف سے بلاوے آتے رہتے تھے۔ اور وہ خاصی مصروف رہا کرتی تھیں۔ بچے کی ولادت سے قبل زچہ اور بچہ کی صحت کے لئے حفاظتی تدابیر اور علاج معالجہ وغیرہ سے کوئی آگاہ نہ تھا، بلکہ عین ولادت کے موقع پر دائی کو گھر بلایا جاتا تھا۔ متمول علاقہ ہونے کی وجہ سے کھارادار میں ایک دائی رہتی تھی۔ جسے شہر کی بہترین دائی سمجھا جاتا تھا۔ اسے زچگی کے روزمرہ کے واقعات میں مسلسل خدمات سرانجام دینے کے باعث اس قسم کے امور کا کافی تجربہ تھا۔ چنانچہ والدہ نے اس عورت کی خدمات پہلے

سے حاصل کرلیں۔ اسی عورت کے ہاتھوں میری والدہ کے ہاں ان کے پہلے بچے کی ولادت عمل میں آئی۔ یہ لڑکا تھا۔ اس روز تاریخ تھی 25 دسمبر 1876ء اور اتوار کا دن تھا۔

بچہ کمزور اور دبلا پتلا سا تھا۔ اس کے ہاتھ لمبے اور پتلے پتلے تھے۔ سر بڑا اور لمبوترا سا تھا۔ والدین اس کی صحت کے بارے میں بہت پریشان تھے۔ بچے کا وزن بھی معمول سے کئی پونڈ کم تھا۔ انہوں نے بچے کا ایک ڈاکٹر سے معائنہ کرایا، جس نے بتایا کہ ظاہری کمزوری کے سوا بچے کی صحت یا اعضاء میں کوئی نقص نہیں ہے اور یہ کہ والدین کو اس کی صحت کے بارے میں زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے، مگر ایک ڈاکٹر کی خالی خولی یقین دہانی سے ایک شفیق ماں کے خدشات اور تشویش کیونکر ختم ہوسکتی تھی۔

اس کے بعد بچے کا نام رکھنے کا سوال پیدا ہوا۔ اب تک کاٹھیاواڑ میں آباد ہمارے خاندان کے مردوں کے نام بڑی حد تک ہندوؤں کے ناموں سے ملتے جلتے تھے، مگر سندھ ایک مسلم صوبہ تھا اور یہاں والدین کے پاس پڑوس میں آباد لوگوں کے بچوں کے نام مسلمانوں جیسے تھے۔ والدین کا اتفاق رائے اس پر ہوا کہ ان کے پہلے بیٹے کا نام محمد علی اچھا رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچے کا نام یہی رکھا۔

میری والدہ محمد علی سے انتہائی محبت کرتی تھیں اور اس حقیقت کے باوجود کہ انہوں نے بعد ازاں چھ اور بچوں کو بھی جنم دیا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک محمد علی سے سب سے زیادہ پیار کرتی رہیں۔ رحمت، مریم، احمد علی، شیریں، فاطمہ اور بندہ علی ان کے دیگر بچے تھے، جن میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں تھیں۔

میرے والد کے کندھوں پر بڑھتے ہوئے کاروبار کی بھاری ذمہ داریاں تھیں، مگر میری والدہ کا مسلسل اصرار تھا کہ محمد علی کو آبائی گاؤں پانیلی سے دس میل کے فاصلے پر واقع گانود میں

حسن پیر کی درگاہ پر لے جا کر ان کی رسم عقیقہ وہاں ادا کی جائے۔ بچپن ہی سے میری والدہ نے اس درگاہ میں مدفون اس پیر کے عقیدت مندوں سے ان کی معجز نما قوتوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ ان (میٹھی بائی) کی والدہ کی پیش گوئی نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ ایک عظیم مستقبل محمد علی کا منتظر ہے۔ اس لئے بھی وہ اسے حسن پیر کی درگاہ پر لے جانا چاہتی تھیں۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق وہاں محمد علی کے سر کے بارے اتارنے کی رسم منعقد کی جانی تھی۔ بچے کی والدہ اپنی منت پوری ہونے کے لئے مقدس پیر کی نوازشات طلب کرنا چاہتی تھی۔ پہلے پہل تو میرے والد نے یہ کہہ کر اس سے بچنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ماہ سے زائد عرصے تک کراچی سے باہر نہیں رہ سکتے۔ مگر آخر کار انہیں اپنی نوجوان بیوی کے دلائل کے سامنے نرم ہونا پڑا۔ اور یوں اپنے چند ماہ کے بیٹے کے ساتھ ہمارے والدین نے کراچی سے ویراوال جانے والی ایک بادبانی کشتی میں اپنی نشستیں بک کروالیں، ویراوال نامی بندرگاہ کاٹھیاواڑ میں واقع ہے۔ اس سفر میں طوفان اور شدید سمندری بارش سے دوچار ہونے کے خدشات بھی موجود تھے، مگر انہوں نے اس کی کوئی پرواہ نہ کی۔

کشتی خراب حالت میں تھی جو مسافروں کے بوجھ سے بری طرح لدی ہوئی تھی، طوفان میں پھنس گئی اور کھلے سمندر میں لکڑی کے تختے کی طرح ڈگمگانے لگی۔ کشتی میں موجود لوگ خوف و ہراس میں مبتلا تھے۔ ایسے موقعوں پر گھبراہٹ بہت تیزی سے پھیلا کرتی ہے۔ میرے والد سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے کہ نہ جانے یہ طوفان کب تھمے گا، میری والدہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگائے کشتی کے مسافروں کا سفر بخیر و عافیت ختم ہونے کی دعائیں کر رہی تھیں۔ جس میں ان کا لاڈلا بیٹا محمد علی بھی شامل تھا۔ طوفان کے بعد سمندر پر عجیب و غریب سکوت طاری ہو گیا اور کشتی بآسانی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ کئی روز بعد میری والدہ نے والد کو بتایا کہ پریشانی کے

ان لمحات کے دوران انہوں نے منت مانی تھی کہ اگر وہ سب بحفاظت اپنی منزل پر پہنچ گئے تو وہ گانود میں حسن پیر کے مزار پر مزید ایک روز قیام کریں گی اور اللہ تعالٰی کی رحمت پر اس کا شکر ادا کرینگی۔

کشتی ویراوال بندرگاہ پر لنگر انداز ہوئی اور بخیر و عافیت خشکی پر قدم رکھنے میں کامیاب ہوگئے وہاں سے گانود تک چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے لئے انہوں نے ایک بیل گاڑی کرائے پر لے لی۔ بحیرہ عرب میں ایک طوفانی سفر اور ہچکولے کھاتی ہوئی بیل گاڑی میں سواری کے بعد یہ لوگ بالآخر اپنی منزل پر جا پہنچے۔ اور اب میرا چھوٹا بھائی محمد علی اپنی والدہ کی آغوش میں اور بے شمار رشتہ داروں کے ہجوم میں گھرا حسن پیر کی درگاہ پر سر منڈانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ یوں میری والدہ کی منت پوری ہوگئی۔

حسن پیر کی زندگی کے حقائق داستانوں کے ساتھ یوں غلط ملط ہوگئے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ تاہم یہ بات مسلم ہے کہ حسن پیر اسماعیلی مبلغ کی حثیت سے ایران سے خشکی کے راستے بلوچستان سے ہوتے ہوئے اس علاقے میں آئے تھے۔ راستے میں انہوں نے کچھ عرصہ ملتان میں بھی قیام کیا تھا۔ ان کی صوفیانہ اور مثالی زندگی کے باعث بہت سے لوگ ان کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگئے تھے اور بہت سے غیر مسلموں نیان کے ہاتھ پر اسلا مقبول کیا تھا۔ یہ بزرگ بعد ازاں سندھ کی جانب روانہ ہوگئے۔ جہاں انہوں نے تبلیغ کا کام جاری رکھا، پھر وہ کچھ میں آنکلے، اور بالآخر پانیلی کے قریب ایک مقام پر خیمہ زن ہوئے۔ انہوں نے اپنی باقی ماندہ زندگی اس علاقے میں آباد غیر مسلموں کو اسلام کی تبلیغ کرنے میں گذار دی۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تھے، ان کی ذات سے بہت سی حکایات

وابستہہیں ،اس قسم کی باتیں عموماً ایسی شخصیات سے وابستہ کردی جاتی ہیں جن کی زندگی کے اصل واقعات اور کارنامے تاریخی شہادتوں سے محروم ہوا کرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ حسن پیران مسلمان صوفیائے کرام کے نقش قدم پر گامزن تھے، جن کے دن قرآن کی تعلیم اور اسلام کا پیغام پھیلانے اور راتیں عافانہ مراقبوں میں گذرتی ہیں، ان کی عادت تھی کہ رات کو جلدی سو جایا کرتے تھے اور علی الصبح دو بجے کے قریب بیدار ہو کر اپنے خیمے کے باہر دریائے بدھار کے کنارے صبح کی نماز تک استغراق رہا کرتے تھے۔ایک رات جب وہ رب سے لو لگائے بیٹھے تھے کہ پانی کی ایک بہت بڑی لہر دریا کا کنارا اچھلانگ کر حفاظتی پشتے سے بھی آگے تک نکل گئی۔دریا کے منہ زور پانی کے اچانک آنے والے ریلے کے بہاؤ پر سفر کرتی اس جگہ کے قریب کنارے سے آ لگی، جسے گانود گاؤں کہا جاتا ہے، یہاں رابای ذات کے غیر مسلموں کی اکثریت آباد تھی۔ان لوگوں کا آبائی پیشہ گائیں پالنا تھا۔

علی الصبح جب چندر اباری دریائے بدھار کے کنارے پہنچے تو انہوں نے حسن پیر کیلاش دیکھی جسے دریا کی لہریں ساحل پر چھوڑ گئی تھیں۔انہوں نے ان بزرگ کو فوراً پہچان لیا، جن کی شہرت پانیلی گاؤں کی جغرافیائی حدود سے نکل کر آس پاس کے علاقوں تک پھیل چکی تھی، راباریوں کے بڑوں نے باہمصلاح مشورہ کیا۔انہوں نے محسوس کیا کہ ان بزرگ کی نعش انہیں قدرت کی جانب سے تحفے میں دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ اس کی شایانِ شان طریقے سے تدفین کریں گے اور ان کا مزار بھی تعمیر کرائیں گے۔ان لوگوں کا خیال تھا کہ حسن پیر کیدرگاہ تعمیر کرنے سے ان کے گاؤں میں خوشحالی آجائے گی۔

اس طرح حسن پیر گانود گاؤں میں دفن ہوئے۔ برسوں گذر جانے کے باوجود گونڈل ریاست کے لوگوں کا حسن پیر کی درگاہ کی زیارت کرنے کے لئے جوش وخروش کم نہیں ہوا۔

یہاں تک کہ ان بزرگ کی درگاہ پر آج بھی ان کا عرس ہر سال باقاعدگی سے منعقد ہوتا ہے۔ جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند شریک ہوتے ہیں۔

حسن پیر کی درگاہ پر عقیقہ کی رسم سرانجام دینے کے بعد میرے والدین بالوں سے صاف سر والے ننھے منے بیٹے کو لے اپنے آبائی گاؤں پانیلی آ گئے۔ یہ سفر بھی انہوں نے بیل گاڑی میں طے کیا۔ میرے والد کے لڑکپن کے دوست اور رشتہ دار کراچی میں ان کی کامیابیوں کے بارے میں شاندار کہانیاں سن چکے تھے۔ اس کامیابی نے انہیں اس قدر اہمیت دلا دی تھی کہ ان کے آبائی گاؤں کے باشندوں کی نظروں میں ان کیلئے بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے اپنے چہیتے بیٹے کی ولادت کی خوشی منانے کے لئے ایک دعوت کا اہتمام کیا۔ جس میں پورے گاؤں کو رات کے کھانے پر بلایا۔ اپنے بچپن کے دنوں میں، میں نے اپنے بزرگوں سے سنا۔ اس روز پانیلی کے کسی ایک گھر میں بھی چولہا نہیں جلایا گیا تھا۔ لوگوں کے گھروں میں کھانے پکانیکے برتن اور کھانا کھانے کی پلیٹیں بدستور باورچی خانوں کے طاقچوں میں پڑی رہیں۔ گویا یہ بھی اپنی اپنی جگہوں پر آرام کرتے ہوئے ننھے محمد علی کی پیدائش کی خوشی منا رہی ہوں، جو پانیلی کے ایک دیہاتی کا بیٹا تھا۔

پانیلی اور گونڈل میں چند ہفتے قیام کرنے کے بعد میرے والدین اپنے ننھے بیٹے کے ساتھ کراچی واپس آ گئے۔ جس کا ننھا سا ذہن ابھی اس بات کا ادراک نہیں کر سکتا تھا کہ گانو داور پانیلی میں اس کی آمد اس قدر جوش و خروش اور پر مسرت تقریبوں کا باعث بنی رہی ہے، کراچی واپس پہنچ کر میرے والد تو اپنی کاروباری ذمہ داریاں نبھانے میں مصروف ہو گئے، جب کہ والدہ نے اپنی تمام تر توجہ اور وقت اپنے نومولود بیٹے کو دینا شرع کر دیا۔

کسی موقع پر پیسوں کی شدید ضرورت کے باوجود، خاص طور پر جب والدہ کی یہ خواہش

ہوتی۔ میرے والد بودوباش اور روپے پیسے کے معاملے میں محتاط تھے۔ ایک تاجر جو ایک نئے شہر میں پاؤں جمانے کے لئے جدوجہد کررہا تھا، اسے چھوٹی چھوٹی رقوم ے معاملے میں محتاط ہونا ہی چاہئے تھا۔ یہ گھرانہ سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شان وشوکت کی کمی کو ایک خوش وخرم زندگی کے تپاک سے پورا کیا جاتا۔ اگرچہ میرے والد کا کاروبار کافی پھیل گیا۔ تب بھی بے مصرف کاموں پر روپیہ خرچ نہ کرنے کی عادت برقرار رہی۔ دولت آنی جانی چیز ہے، یہ آج آپ پر مہربان ہوسکتی ہے مگر کون جانتا ہے کہ کل اس کا موڈ کیا ہوگا۔ میرے والد نے اسی اصول کے تحت گھر کا بجٹ چلایا۔ جب ہم لوگ بڑے ہوئے تو اس بات کا ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا اثر موجود تھا۔ قائداعظم کی زندگی کا یہ انداز ایسا تھا جو ہمیشہ برقرار رہا۔

محمد علی اب تقریباً چھ سال کے ہوچکے تھے۔ اور میرے والدین نے انہیں گھر پر ہی گجراتی پڑھانے کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کرلیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے اور سب سے قریبی سکول بھی ہمارے گھر سے کافی فاصلے پر تھا۔ یہ فاصلہ اتنا تھا کہ والدین کے خیال میں چھ سال کا بچہ اسے پیدل طے کرنے کے قابل نہیں تھا۔ محمد علی کو پڑھنے کے لئے جو سبق دیا جاتا، وہ اس سے لاپرواہ سے رہتے۔ وہ قطعی طور پر جمع تفریق کی حسابی دنیا میں داخل ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح استاد کے ساتھ ان کا وقت ایک ناگوار مجبوری کی حالت میں گذرتا۔ اس کے برعکس جب وہ پڑوسی لڑکون کے ساتھ کھیل میں مشغول ہوتے تو زیادہ خوش وخرم رہا کرتے اور زیادہ بے تکلفی سے کام لیتے۔ ان لڑکوں میں انہیں کھیلوں میں مہارت رکھنے والے بچے کی شہرت حاصل تھی۔ ان کے ساتھ بچے انہیں اپنے بچگانہ ذہنوں میں اپنا لیڈر تصور کرتے اور محمد علی نے بھی محسوس کرنا شروع کردیا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے بہتر ہیں۔ جب وہ نو سال کے ہوئے تو انہیں پرائمری سکول میں داخل کرادیا گیا۔ جہاں امتحان کے

وقت انہیں اپنے ہم جماعت طلباء کے ساتھ پڑھائی میں مقابلہ کرنا پڑا۔

انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ سکول میں دوسرے لڑکے نے ان سے زیادہ نمبر حاصل کر کے ان سے آگے نکل گئے تھے۔ کھیلوں میں وہ دوسرے لڑکوں کو شکست دیا کرتے تھے، وہ خود کو ہمیشہ دوسروں سے بہتر اور برتر سمجھتے تھے، مگر انہیں معلوم ہوا کہ وہ اپنی کلاس میں اول پوزیشن کے مالک نہیں تھے، سکول جانے کے بعد انہیں اپنے کھیل کے اوقات سے کئی گھنٹے پڑھائی کے لئے نکالنے پڑے تھے اور سکول میں اتنا وقت رہ کر بھی انہیں بہترین طالبعلم کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کا دل کتابون اور سکول سے اچاٹ ہو گیا۔ جس نے میرے والد کو پریشان کر دیا۔ وہ اپنے بیٹے کو مناسب تعلیم دلوانا چاہتے تھے تا کہ وہ میٹرک کرنے کے بعد ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو سکے۔ میری والدہ جنہیں محمد علی کی خوش بختی پر اندھا اعتماد تھا۔ اکثر کہا کرتی تھیں: میرا محمد علی بہت بڑا آدمی بنے گا، وہ بہت ذہین اور ہوشیار ہو گا۔ وہ دوسرے لڑکوں سے بہت بہتر ثابت ہو گا مگر اب انہیں اپنے خواب ٹوٹ کر زمین پر بکھرتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

ماں نے انہیں پیار سے سمجھایا کہ وہ باقاعدگی سے سکول جایا کریں اور اپنی تعلیم کی جانب سنجیدگی سے توجہ دیں کیونکہ صرف اس طرح وہ زندگی میں آگے بڑھ سکتے ہیں اور ایک بڑے آدمی بن سکتے ہیں۔ جو دوسروں سے بلند و برتر اور ممتاز ہو گا۔ بچے کی ہٹ دھرمی پر شدید رنجیدہ ہونے کے باوجود والد نے ان کے ساتھ نرمی سے کام لیا اور ان سے کہا کہ وہ اپنی کتابوں پر پوری طرح توجہ دیتے رہیں۔ ننھے محمد علی نے کہا: ''ابا جان مجھے سکول جانا اچھا نہیں لگتا۔''

''پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ابا جان میں آپ کے ساتھ دفتر میں بیٹھ کر کاروبار سیکھنا چاہتا ہوں۔''

''مگر ابھی تم اس کے لئے بہت چھوٹے ہو محمد علی۔''

''میں آپ کے دفتر میں بیٹھ کر سکول کی نسبت زیادہ بہتر کام کروں گا۔''

میرے والد ذہین انسان تھے۔انہوں نے یہ کہتے ہوئے بیٹے کو ترغیب دینے کی کوشش کی۔محمد علی میرے دفتر کا ڈسپلن بہت سخت ہے۔تمہیں میرے ساتھ صبح آٹھ بجے دفتر جانا پڑے گا۔دوپہر کے کھانے کے لئے ہم دو بجے سے چار بجے تک گھر واپس آئیں گے۔اور اس کے بعد ہمیں دوبارہ چار سے نو بجے رات تک دفتر میں رہنا ہوگا؟

''میں ایسا ہی کروں گا، ابا جان''

''مگر تمہیں کھیلنے کے لئے بالکل وقت نہیں ملے گا۔''

''مجھے اس کی پرواہ نہیں۔''

اور یوں ننھے منے محمد علی والد کے دفتر اور اپنے کمرہ جماعت کے درمیانی فاصلوں کو توڑتے ہوئے میرے والد کے ساتھ شریکِ کار ہو گئے۔لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ وہ دفتر میں کوئی کام کرنے کے قابل نہیں ہیں۔ہر کام کا تعلق لکھنے پڑھنے سے تھا۔وصول اور ادا کی جانے والی رقوم رجسٹروں اور کھاتوں میں درج کی جاتی تھیں اور انہیں نہ پڑھنا لکھنا آتا تھا اور نہ ہی حساب کتاب۔دفتر میں وہ صرف چھوٹے موٹے کام کر سکتے تھے جنہیں وہ کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔اس کے علاوہ مال کی خرید و فروخت اور دوسرے اہم امور کے متعلق فیصلے ہمارے والد اپنے کاروباری مشیروں یا ورکروں کے مشورے سے خود کرتے تھے۔محمد علی سے نہ تو کوئی مشورہ کرتا تھا اور نہ ہی ان کی رضامندی یا منظوری حاصل کرتا تھا۔سب سے پریشان کن بات یہ تھی کہ دفتر میں بیٹھنے سے وہ اپنے پسندیدہ کھیلوں سے یکسر الگ تھلگ ہو کر رہ گئے تھے۔

چنانچہ صرف دو ماہ کے اندر ہی وہ دفتر کے کام سے اکتا گئے اور ایک روز انہوں نے میرے

والد کو یہ کہہ کر حیران کر دیا: ''ابا جان مجھے دفتر میں کام کرنا پسند نہیں ہے۔''

''پھر تم کیا کرو گے محمد علی؟''

''میں واپس سکول جانا چاہتا ہوں۔''

میرے والد بہت خوش ہوئے مگر انہوں نے اپنی خوشی کو چھپائے رکھنا ہی بہتر سمجھا۔ انہوں نے کہا: ''دیکھو بیٹا زندگی کو سمجھنے کے دو ہی راستے ہیں۔''

''ابا جان، وہ کون کون سے ہیں؟'' محمد علی نے پوچھا۔

''ایک یہ کہ آپ اپنے بزرگوں کی دانش اور تجربے پر بھروسہ کریں۔ ان کی نصیحت قبول کریں اور ان کے مشورے کے عین مطابق عمل کریں۔''

''اور دوسرا راستہ کون سا ہے ابا جان؟''

''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ خود اپنے راستے پر چلیں، چاہے غلطیاں کریں مگر ان سے سبق سیکھیں اور زندگی کی شدید اور تکلیف دہ ٹھوکروں اور مشکلات سے زندگی کو سیکھیں اور سمجھیں۔''

کم عمر محمد علی اپنے والد کی باتوں کو پوری توجہ سے سنتے رہے۔ یہ واقعہ قائد کے اس وصف کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ زندگی بھر خود اپنے راستے پر چلنے کو ترجیح دیتے رہے۔

سکول واپس لوٹ آنے پر وہ ایک بالکل بدلے ہوئے بچے تھے۔ اب وہ لاتعلق، غیر متوجہ اور اپنے ہم جماعتوں سے کسی طرح بھی پیچھے نہ رہتے تھے۔ وہ اپنے ضائع شدہ وقت کی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ ان کے ہم عمر بلکہ ان سے چھوٹے لڑکے بھی پڑھنے لکھنے میں اب تک ان سے بہت آگے نکل گئے تھے۔ وہ اپنے اسباق انتہائی محنت سے یاد کرتے تھے۔ وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے تھے۔ وہ آگے بڑھنے کا عزم کر چکے تھے۔ میرے والد محمد علی کے سنجیدگی سے پڑھائی پر توجہ دینے سے بہت خوش تھے، ایک روز سرِ راہ ان کی ملاقات اپنے بیٹے کے استاد سے

ہوئی تو انہوں نے پوچھا کہ ان کا بیٹا پڑھائی میں کیسا جا رہا ہے۔ استاد نے کہا: ''وہ بہتر ہوتا جا رہا ہے مگر میں آپ کو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کا بیٹا حساب میں بہت کمزور ہے۔''

اس سے میرے والد کو بے حد مایوس ہوئی۔ ان کا پہلے ہی خیال تھا کہ ان کے بیٹے کی والدہ کے یقین کے عین برعکس ان کا بیٹا غیر معمولی ذہانت یا اوصاف کا مالک نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان کا بیٹا جوان ہو کر ان کے لئے قبل از وقت سہارے کا باعث بن سکے گے۔ وہ اپنے اساتذہ کے سامنے پہلے ہی خود کو ایک ہونہار طالب علم ثابت نہیں کر سکا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ سخت امتحان کے بل پر وہ امتحان میں کامیابی تو حاصل کر لے گا، لیکن اس کیب عد دفتر کلکوں کے گمنام عہدوں میں گم ہو کر رہ جائے گا۔ میرے والد چاہتے تھے کہ محمد علی حساب میں طاق ہو جائے کیونکہ کاروبار میں حساب کتاب ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ جب ان کا بیٹا ان سے کاروبار سنبھالے تو ان کی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی ایک فعال کاروباری ادارے کی طرح آگے ہی آگے بڑھتی رہے۔ میرے والد سوچنے لگے: ''حساب میں کمزور۔ حیرت ہے یہ لڑکا آخر کیا بنے گا۔''

لیکن محمد علی پر میری والدہ کا اعتماد غیر متزلزل تھا۔ وہ کہتیں: ''تم دیکھنا تو سہی میرا محمد علی بہت اچھے اچھے کام کرے گا اور بہت سے لوگ اس سے حسد کرنے لگیں گے۔''

میرے والد نے فیصلہ کیا کہ اپنی بیوی کے وجدان پر چلنے کے بجائے انہیں وہ کام کرنا چاہئے جو بظاہر میرے بھائی کے بہترین مفاد میں ہے، انہوں نے محمد علی کو اپنے گھر سے دور کسی سکول بھجوانے کا فیصلہ کیا، کیونکہ کھارادر کے پرائمری سکول میں ان کے ہم جماعتوں کے ساتھ میل جول کے ان پر منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ یہ لڑکے محمد علی کو ہمیشہ کتابیں چھوڑ کر گولیاں، لٹو، گلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ والد نے فیصلہ کیا کہ محمد

علی کو نیونہم روڈ پر اپنے گھر سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع سندھ میں مسلمانوں کے واحد سکول سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کروا دیا جائے۔ اس سکول کے بانی خان بہادر حسن علی آفندی تھے۔

محمد علی کو سندھ مدرستہ الاسلام میں گجراتی کی چوتھی جماعت میں داخل کرایا گیا، تو ان کی عمر تقریباً دس برس تھی۔ سکول کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ سکول میں داخل کئے جانے والے لڑکوں میں ان کا نمبر 114 تھا۔ سکول کی تبدیلی سے محمد علی کے اپنی تعلیم کی جانب رجحان میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ بدستور سکول میں تعلیم کے میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے بجائے کھیل کے گراؤنڈ میں کامیابیاں حاصل کرتے رہے۔

تقریباً انہی دنوں اتفاق سے میرے والد کی اکلوتی بہن بمبئی سے کراچی آئی ہوئی تھیں۔ مان بائی کی شادی بمبئی میں ہوئی تھی اور وہ وہیں اپنے خاوند کے ساتھ رہائش پذیر تھیں۔ ہم انہیں مان بائی پوفی (پھوپھی) کہا کرتے تھے۔۔ وہ نہایت زندہ دل، شگفتہ مزاج اور مزاحیہ طبیعت کی مالک تھیں۔ یہی نہیں، وہ درسی تعلیم کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین بھی تھیں۔ میرے والد اپنی بہن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ اور مان بائی بھی اپنے سب سے چھوٹے بھائی جناح پر جان چھڑکتی تھیں۔ دونوں کے درمیان بے حد محبت تھی اور یہ ان کے آخری دنوں تک بدستور قائم رہی۔ جب میں قائداعظم کے ساتھ اپنی چالیس سالہ رفات پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے بے ساختہ دوستی اور خلوص کے وہ رشتے یاد آ جاتے ہیں جو میرے عالد اور ان کی بہن کے درمیان قائم تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کئی سالوں بعد مان بائی اپنے شوہر کے ساتھ کراچی میں مستقل رہائش پذیر ہونے کیلئے آئیں تو وہ اکثر ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔

وہ قصے کہانیاں سنانے میں بڑی ماہر تھیں۔ مجھے آج تک حیرت ہوتی ہے کہ وہ سینکڑوں

کہانیاں آخر کس طرح زبانی یاد رکھا کرتی ہوں گی۔ وہ کبھی سکول نہیں گئی تھیں۔ اس لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ یہ کہانیاں کتابوں وغیرہ سے پڑھ لیتی ہوں۔ غروب آفتاب کے بعد مان بائی پوفی میری بہنوں اور میرے رشتے کے بھائیوں (کزنز) کو اپنے اردگرد اکٹھا کرلیتیں۔ وہ ہماری توجہ کا مرکز بن جایا کرتیں اور ہم رات مبہوت اور مسحور ہو کر ان کی کہانیاں سنا کرتے۔ وہ پریوں اور اڑنے والے قالینوں کے لئے کہانیاں سناتیں، جنوں اور بلاؤں کے قصے ہوتے، اور یہ سب ہمارے ننھے منے ذہنوں کے لئے نہایت دلچسپی کا باعث ہوتے۔ یہ کہانیاں ہماری دنیا سے دور آباد کسی دوسرے ہی عالم کے واقعات معلوم ہوتے۔

ایک روز میرے والد، والدہ اور مان بائی پوفی سر جوڑ کر بیٹھے کہ آخر محمد علی کا کیا کیا جائے۔ جس نے اپنی تعلیم میں دلچسپی لینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کی عمر دس سال ہو چکی تھی اور ابھی تک اس نے گجراتی کی چوتھی جمات بھی پاس نہیں کی تھی۔ مان بائی نے تجویز پیش کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ بمبئ لے جائیں گی، امید ہے ماحول کی تبدیلی سے اس کا دل پڑھائی کی طرف مائل ہو جائے گا۔ میری والدہ کو اس تجویز پر راضی کرنے کی کوشش کی گئی اور انہوں نے بادلِ نخواستہ اس کی اجازت دے دی۔ اس طرح محمد علی مان بائی پھپھی کے ہمراہ بمبئ چلے گئے۔

محمد علی کو بمبئ کے انجمن الاسلام سکول میں داخل کروا دیا گیا۔ کچھ عرصے تک محمد علی نے اپنی کتابوں پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کر لی۔ اس طرح وہ انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لینے کے اہل ہو گئے۔ ادھر والدہ کا اپنے چہیتے بیٹے کی جدائی میں برا حال تھا۔ بالآخر ماں کی محبت باپ کی منطق پر غالب آگئی اور محمد علی بمبئ سے کراچی واپس آگئے۔

میرے والد نے انہیں ایک مرتبہ پھر سندھ مدرستہ الاسلام میں داخل کرادیا۔ سکول کے

رجسٹر کے مطابق اس مرتبہ ان کا داخلہ نمبر 178 تھا۔ 23 ستمبر 1887ء تاریخ داخلہ تھی۔ گذشتہ تعلیمی ادارے کے خانے میں انجمن الاسلام سکول بمبئی کا نام درج ہے۔

اب تک محمد علی کو جنون کی حد تک گھڑ سواری کا شوق ہو چکا تھا۔ میرے والد کے پاس سواری کے لئے کئی بگھیاں تھیں۔ جو اس زمانے کے مطابق سواری کا ایک رئیسانہ ذریعہ تھیں۔ موٹر کاروں کا دور ابھی بہت دور تھا۔ میرے والد کے اصطبل میں کئی شاندار گھوڑے تھے۔ محمد علی نے جلد ہی گھڑ سواری سیکھ لی۔ وہ اس کھیل سے بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ سکول میں ان کے ایک دوست ہوا کرتے تھے۔ کریم قاسم جو کھارادر ہی کے ایک تاجر کے بیٹے تھے۔ دونوں لڑکے اکٹھے روزانہ دور تک گھڑ سواری کیا کرتے تھے۔

محمد علی اپنے گھوڑوں سے پیار کرتے تھے جو گردنیں تان کر سیدھے کھڑے ہوتے تھے، اور طاقت اور خود اعتماد کے مظہر ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ فطرت کے قاعدے کے تحت زندگی ہمیشہ عمودی خطوط پر استوار ہوتی ہے۔ گھوڑے سیدھے اور تن کر کھڑے ہوتے ہیں۔ درختوں کا حال بھی ایسا ہوتا ہے۔ شاخوں پر پھول عموداً کھلتے ہیں۔ انسان سیدھا کھڑا ہو کر چلتا ہے۔ اسی طرح پرندے اور درندے بھی۔ گنبد اور مینار آسمان کو چھو لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں اصول بنا لیا کہ وہ نہ صرف سامنے دیکھیں گے بلکہ اپنا سر بھی بلند رکھیں گے۔ وہ مشکلات کے آگے نہیں جھکیں گے، بلکہ ان کا یہ چیلنج قبول کر کے ان پر قابو پا لینے کی جدوجہد کرینگے۔ وہ صنوبر کے اونچے درخت کی مانند بنیں گے، طوفان جسے چھو سکتے ہیں، مگر جھکا نہیں سکتے۔

وہ سکول میں اپنے دن امتحان میں کامیابی کی کوششوں میں گذارنے لگے۔ ان کی شامیں گھڑ سواری کے لئے واقف تھیں۔

مگر تبدیلی کی جانب ان کا رجحان ایک بار پھر غالب آیا اور انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ انہیں کسی دوسرے سکول میں داخل کرا دیں۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد میرے والد نے ایسا کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی، سندھ مدرسہ کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ انگریزی کی چوتھی کلاس میں تھے تو 5 جنوری 1891ء کو انہوں نے اس سکول کو ایک مرتبہ پھر خیر باد کہہ دیا۔ ان کی اگلی درس گاہ لارنس روڈ کراچی کا سی ایم ایس ہائی سکول تھی۔ مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں موخر الذکر سکول زیادہ پسند نہیں آیا۔ ایک بار پھر انہوں نے والد سے درخواست کی کہ انہیں واپس سندھ مدرسہ میں داخل کرا دیا جائے۔ چنانچہ ان کی اس خواہش کے مطابق ایک ماہ بعد 9 فروری 1891ء کو انہیں تیسری مرتبہ سندھ مدرسہ میں انگریزی کی چوتھی کلاس میں داخل کر دیا گیا۔

اب ان کی عمر پندرہ برس ہو چکی تھی اور میرے والد اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونے لگے تھے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ آخر ان کا بیٹا کیا بنے گا۔

گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل منیجر نے جو اب تک میرے والد کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا، پیش کش کی کہ وہ محمد علی کو لندن میں اپنی فرم کے صدر دفتر میں تین سال کے لئے اپرنٹس کے طور پر بھجوا سکتا ہے۔ وہاں اسے کاروبار کا نظم و نسق چلانے کی عملی تربیت دی جائے گی۔ یہ تربیت لندن سے واپسی پر محمد علی کے لئے اپنے والد کا کاروبار سنبھالنے میں بہترین معاون ثابت ہوگی۔ جنرل منیجر کو یقین تھا کہ اس مرحلے پر یہ نوجوان اپنے والد کے لئے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوگا اور وہ کاروبار کو مزید پھیلانے میں والد کا مددگار بنے گا۔ اس تجویز پر خوشحال تاجر کا دل بے حد خوش ہوا، جو قائل ہو چکا تھا کہ لندن میں ایسے بھرپور عملی تجربے کے بعد ان کا بیٹا خاندانی کاروبار میں یقیناً چند نئی اور منافع بخش راہوں کا اضافہ کرے گا۔

مگر ان کے لئے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کام پر کتنا روپیہ صرف ہوگا، جس کے بعد طویل عرصے کے دوران تو شاید ان کے خاندانکو فوائد حاصل ہوں مگر بیٹے کو اس قسم کی تربیت دلانے سے فوری طور پر فائدے کی بہرحال کوئی امید نہیں تھی۔ میرے والد نے اپنے انگریز دوست سے دریافت کیا کہ کراچی سے لندن میں قیام وطعام پر انہیں ماہانہ کس قدر رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ متوقع اخراجات کے اعداد وشمار کا تفصیل اور احتیاط سے جائزہ لیا گیا۔ اگرچہ تین سال کے دوران خرچ کی جانے والی مجموعی رقم خاصی تھی۔ مگر میرے والد نے فیصلہ کیا کہ وہ میسرز گراہمز کے پاس لندن میں یہ رقم پیشگی جمع کرادیا کرینگے۔ تاکہ ان کا بیٹا اپنی تربیت تسلسل کے ساتھ جاری رکھ سکے۔ انہوں نے سوچا کہ کاروبار کی کامیابی تو ہوا کی طرح عارضی ہوا کرتی ہے اور یہ ہوا پیشگی اطلاع کے بغیر کسی بھی وقت اپنا رخ بدل سکتی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر ایک بزنس مین جو سخت کوشی سے ابھرا تھا، کی دانائی بے حد سود مند ثابت ہوئی۔ اس کے بغیر لندن میں میرے بھائی کا کیریئر دفعتاً ختم ہوجاتا۔

مگر میری والدہ بدستور اپنے موقف پر قائم تھیں۔ وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو تین برس کے لئے کس طرح خود سے جدا کرسکتی تھیں۔ والد نے انہیں سمجھایا کہ محمد علی کو لندن بھیجنا نہ صرف خود ان کے نوجوان بیٹھے کے بلکہ خاندانی فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی کے بھی مفاد میں ہوگا اور پھر یہ کہ تین سال کا عرصہ ایسا زیادہ بھی نہیں، یہ وقت جلد ہی گذر جائے گا۔ کئی روز کی تسلی دلاسوں اور استدلال کے بعد بالآخر والدہ رضامند ہوگئیں، مگر اس رضامندی کے لئے انہوں نے ایک شرط عائد کردی۔ ان کے نزدیک کسی غیر شادی شدہ نوجوان کو انگلستان بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہوسکتا تھا۔ خاص طور پر محمد علی جیسے خوبرو نوجوان کا غیر شادی شدہ حالت میں وہاں جانا بالکل ٹھیک نہیں تھا۔ والدہ کو اندیشہ تھا کہ محمد علی انگلستان میں کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کرلیں اور

اگر ایسا ہوا تو یہ جناح پونجا خاندان کے لئے ایک سانحے سے کم نہ ہوگا۔ والدان کے دلائل سے متفق ہوگئے۔ مگر اب سوال یہ اٹھا کہ محمد علی کی شادی کہاں کی جائے۔

میری والدہ کے پاس اس سوال کا جواب پہلے ہی سے تیار تھا۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی شیعہ خاندان کو جانتی تھیں جن سے ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ ان کی ایک لڑکی ایمی بائی شادی کے قابل ہو چکی تھی۔ والدہ کے خیال میں وہ محمد علی کی دلہن بننے کے لئے بالکل موزوں تھی۔ میرے والد کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا، مگر والدین نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی اس فیصلے سے آگاہ کر دیں۔ اس زمانے میں بچوں کی شادیاں والدین ہی طے کیا کرتے تھے۔ لڑکی اور لڑکے کے پاس بڑوں کا فیصلہ قبول کر لینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً والدین جانتے تھے کہ ان کے بچے کیلئے کیا بہتر ہے۔

شاید قائداعظمؒ نے اپنی زندگی کا یہ واحد اہم فیصلہ کسی دوسرے کو کرنے کی اجازت دی تھی۔ وہ اپنی والدہ سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ ان کی بات سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اپنے والد کی دنیاوی معاملات میں فہم و فراست پر اتنا بھروسہ تھا کہ انہیں یقین تھا کہ وہ شاید ہی کوئی غلطی کرینگے، اس زمان کے دستور کے مطابق انہوں نے ایک فرمانبردار بیٹے کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا اور اپنے والدین کا فیصلہ قبول کر لیا۔ اس طرح ان کی منگنی پانیلی کی ایمی بائی سے ہوگئی۔

اس موقع پر اس نوجوان نے، جس کی اپنی سوچ اور اپنی ایک مرضی تھی اور جو زندگی کی مشکلات میں سے اپنا راستہ بنانے کا عزم کر چکا تھا۔ کسی قدر تامل کا اظہار کیا، انہیں ایک ایسی لڑکی ساتھ شادی کرنے میں بنیادی طور پر اعتراض تھا کہ انہوں نے اسے نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی اس سے بات کی تھی، مگر یہ اعتراض والدہ کی یقین دہانی کی دھوپ میں ہلکی دھند کی طرح

غائب ہوگیا۔ انہوں نے اپنے بیٹے کو یقین دلایا کہ اس قسم کے معاملات میں ماں کی دعائیں بہت بھاری ثابت ہوا کرتی ہیں جن کے نتیجے میں ایسی شادیاں بہت خوش وخرم اور پرسکون ازدواجی زندگی پر منتج ہوا کرتی ہیں۔

اس منگنی کے نتیجے میں بعدازاں ان کی شادی ہوئی مگر اس سے قبل 30 جنوری 1892ء کو انہیں سندھ مدرسہ کو خیر باد کہنا پڑا جب کہ وہ انگلش کی پانچویں جماعت میں تھے، سکول کے ریکارڈ میں اس واقعہ کا اندراج یوں ملتا ہے:

''محمد علی جناح بھائی اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ جانے کے لئے سکول چھوڑ گئے۔''

9 اگست 1947ء کو گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر کے دوران انہوں نے اپنے بچپن کی سہانی یادیں تازہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ہاں میں کراچی میں پیدا ہوا تھا اور لڑکپن میں کراچی ہی کی ریت پر گولیاں کھیلا کرتا تھا۔ میں نے سکول کی تعلیم کراچی میں حاصل کی تھی۔''

انہوں نے اپنی کوششوں سے بے پناہ تجربہ حاصل کیا تھا اور اسی لئے انہوں نے دوسروں کی جانب سے یہ کرو اور یہ نہ کرو یا ان کے لئے کیا اچھا ہے اور کیا اچھا نہیں ہے۔ جیسے احکامات قبول کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ یہ عادت جو ان میں بچپن ہی سے راسخ ہو چکی تھی۔ ان کے ذہن کے سیاسی ارتقاء کے ہیجان انگیز زمانے میں بھی ان کی رہنمائی کرتی رہی۔ مگر یہ تضاد انتہائی حیرت کا باعث ہے۔ کہ شریکِ حیات کے انتخاب کے معاملے میں پسند یا ناپسند کا اختیار انہوں نے کلیتہً اپنی والدہ کو دے دیا۔

میرے والد، والدہ، محمد علی، پوفی مان بائی اور کچھ دوسرے رشتہ دار کراچی سے بحری راستے سے ویراوال روانہ ہوئے وہاں سے محمد علی کی برات بیل گاڑیوں کے ذریعے ہمارے آبائی گاؤں

پانیلی پہنچی۔

فاصلے غیر متوقع اور دلکش کہانیوں کو جنم دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ پانیلی کے سادہ لوح دیہاتیوں کے ذہنوں میں بھی یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ جناح بھائی کراچی جیسے بڑے شہر میں جا کر کروڑ پتی بن چکے ہیں، وہاں سے وہ یورپ اور مشرق بعید کے ممالک کے ساتھ تجارت کرتے ہیں اور ان کا مال سمندر میں بادبانوں کے بغیر چلنے والے جہازوں کے ذریعے ان دور دراز ملکوں کو بھیجا جاتا ہے اور یہ کہ جناح بھائی کا گھر بہت بڑا ہے۔ سواری کے لئے گاڑیاں اور گھوڑے ہیں۔ جی ہاں یہ سب ان سادہ لوح لوگوں کی خیال آرائی اور وہم تھا کہ جناح بھائی نے کراچی میں بے پناہ دولت کمائی تھی۔ پونجا گھرانے کو فخر تھا کہ (ان کی) ایک بہت بڑی بارات پانیلی آ رہی ہے۔

میرے والد ان سب باتوں سے آگاہ تھے۔ وہ اپنے اہلِ خانہ اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنے رشتہ داروں، دوستوں اور پانیلی میں آباد ہر گھرانے کے سربراہ کے لئے بہت سے تحائف لائے تھے۔ جب ان لوگوں کی تعداد اور ان کے لئے لائے جانے والے تحائف کا مقابلہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تحائف کی تعداد بہت کم تھی۔ اس پر میرے والد نے اپنے ایک کزن کو مزید تحائف لانے کے لئے گونڈل بھیجا۔ وہ اپنے ساتھ اچھی خاصی تعداد میں گولے اور پٹاخے بھی لائے تھے تاکہ خواب آلود پانیلی ان کی گرج سے گونج اٹھے اور آنکھیں چندھیا دینے والی ان کی روشنی اردگرد میلوں دور آسمانوں پر بکھر جائے۔ اس زمانے میں بینڈ باجے نہیں ہوا کرتے تھے جنہیں پانیلی کی گلیوں میں گا کر ایک امیر آدمی کے بیٹے کی شادی کا فخریہ اعلان کیا جا سکتا۔ تاہم اس موقع کے لئے گونڈل سے نقارے بجانے والوں کو بلایا گیا تھا۔ جو نیم دائرے کی شکل کے نقاروں کو دو پتلی چھڑیوں کی مدد

سے بجارہے تھے۔ نقاروں کے ساتھ مزید کوئی ساز شامل نہیں تھا۔ مگران کا شوراس قدر تھااور ان کی آواز اور بازگشت ایسی تھی کہ اس سے پانیلی اوراس کے گردونواح کا علاقہ گونج اٹھا تھا۔

گاؤں کی عورتیں رسم کے مطابق کئی روز سے تحائف، کپڑے، زیورات اور مٹھائیاں وغیرہ دلہن کے گھر لارہی تھیں۔ نقارے بجانے والے بارات کے آگے آگے تھے۔ جب کہ خواتین شادی بیاہ کے گیت گاتیں اور رسم کے مطابق راستے میں شاول بکھیرتیں، آہستہ آہستہ سے دلہن کےگھر کی جانب رواں دواں رہتیں۔

ایک ہفتے تک گاؤں کے لوگ دوپہر اور شام کے اجتماعی کھانوں میں مدعو رہے۔ عام حالات میں آزمائش اور دلکشی سے محروم پانیلی میں اس شادی کے باعث اب ایک جشن کا سماں تھا۔ جیسے گونڈل کے دیہات میں سے یہ گاؤں ایک روز خواب سے بیدار ہوتے ہی دلہن کی طرح سج گیا ہو۔ میرے والد کو اخراجات کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ آخر یہ ان کے پہلوٹھی کے بیٹے کی شادی تھی اور کسے معلوم تھا کہ ان کے دوسرے بچوں کی شادیاں کراچی میں ہونا تھیں یا بمبئی میں۔ پوری سج دھج سے کی جانے والی اس شادی سے ان کے اپنے گاؤں کے لوگ بے حد متاثر ہوئے۔ والد کے کراچی واپس چلے جانے کے بعد پانیلی کے لوگوں نے کم از کم اتنا ضرور یاد رکھا ہوگا کہ اس گاؤں کی گلیوں میں کھیلنے والے دوسرے بچوں کی طرح عام سے جناح بھائی اب ایک بڑے شہر کے بڑے تاجر بن چکے تھے۔

جشن کے اس موقع پر دولہا کے خیالات کیا تھے۔ اس کا صرف تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی عمر بمشکل سولہ برس تھی اور ان کی شادی کی جارہی تھی۔ انہوں نے اپنی بہنوں اور کزنز کے علاوہ اس عمر کی کسی لڑکی سے کبھی بات تک نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے اپنی دلہن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ تاہم وہ اتنا ضرور جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے طرزِ زندگی سے انحراف

ضرور کیا تھا۔ وہ اپنے فیصلے خود کرنے کے اپنے مخصوص انداز سے ہٹ گئے تھے۔ وہ اپنی والدہ کی صورت مین تقدیر کے آگے بے بس ہو گئے تھے، جنہوں نے ان کی شادی ایمی بائی سے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

نظر نہ آنے والے سفید دھاگوں میں پروئی ہوئی پھولوں کی لمبی لمبی لڑیوں میں سر سے پاؤں تک چھپے ہوئے محمد علی پانیلی میں اپنے دادا کے گھر سے دولہا بن کر بارات کے جلوس کے ہمراہ اپنے ہونے والے سسر کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں چودہ سالہ ایمی بائی قیمتی نئے ملبوسات اور بھاری بھرکم زیورات پہنے ہاتھوں میں مہندی رچائے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس لے لباس اور چہرے پر نہایت قیمتی عطر چھڑکا ہوا تھا۔ گاؤں کے مولوی صاحب نے رسمِ نکاح ادا کی۔ قرآن حکیم سے چند آیات کی تلاوت کی گئی اور یہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔

میرے والد کو کراچی سے گئے چار ہفتے ہو چکے تھے اور ان دنوں مواصلات کے ذرائع بہت محدود تھے۔ ان کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ وہ پانیلی میں بیٹھے کراچی میں اپنے کاروبار کے متعلق فکرمند ہونے لگے۔۔ ان کی جانب سے بے صبری اور گھبراہٹ کا اظہار ہونے لگا اور انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ جلد از جلد کراچی واپس جانا چاہتے ہیں۔ مگر سماجی رسوم کی اپنی ایک طاقت ہوا کرتی ہے۔ اور خاص طور پر پرانے زمانے میں ایک دور افتادہ گاؤں میں یہ اور بھی سخت تھیں۔ معاشرتی رسم و رواج کو توڑنا مقدس مذہبی روایات کو پامال کرنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ میرے بھائی کے سسرال والے روایات کی سختی سے پیروی کرنے والے لوگ تھے۔ اور انہوں نے یہ بات شائستگی مگر پوری شدت کے ساتھ اپنے سمدھی جناح بھائی پر واضح کر دی تھی کہ ان کی بیٹی دلہن بننے کے بعد ان کے گھر میں اگر تین ماہ تک ممکن نہ ہو تو کم از کم ایک ماہ تک قیام کی ضرورت کرے گی۔۔ اس کے بعد ہی اسے اس کے دلہا کے ساتھ کراچی جانے کی اجازت

دی جاسکتی ہے۔ میرے والد کے لئے اتنا عرصہ پائیلی میں قیام کرنا ممکن نہیں تھا اور وہ کراچی واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ادھر میری والدہ اپنے شوہر کو تنہا کراچی واپس جانے کی اجازت دینے کیلئے تیار نہیں تھیں۔ وہ بے حد مصروف آدمی تھے۔ وہ اتنا زیادہ اور گھنٹوں کام کرتے تھے۔ ایسی صورت میں ضروری تھا کہ والدہ ان کے ہمراہ کراچی واپس آجاتیں۔ گھر بار سنبھالتیں، والد کے لئے کھانا وغیرہ بنا کر گرم گرم ان کی خدمت میں پیش کرتیں۔ نوکروں پر کون اعتبار کرسکتا ہے؟ وہ نہ صرف صفائی کا خیال نہیں رکھتے بلکہ کھانا بھی اچھا نہیں بناتے اور نہ ہی وہ رات کو صاحبِ خانہ کی آمد کو دیر تک انتظار کر سکتے ہیں اور نہ رات کو ان کی واپسی پر گرما گرم چپاتیاں بنا کر دے سکتے ہیں۔ ان حالات میں والدہ بھی پائیلی میں مزید نہیں رک سکتی تھیں۔ البتہ محمد علی پائیلی میں رک سکتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے سسرال والے انہیں ان کی دلہن کو لے کر کراچی جانے کی اجازت دے دیتے۔ مگر میرے بھائی بھی والدین کے ساتھ ہی کراچی واپس جانے کو بے تاب تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شادی کے بندھن سے باہم وابستہ ہونے والے دونوں خاندانوں کے درمیان اس مسئلے پر گرما گرم بحث شروع ہوگئی۔ دونوں خاندان کئی روز تک باہم مل بیٹھ کر مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ مگر اختلافات ختم نہ ہوئے۔ انہیں ایسا محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ کسی لاینحل معاملے میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ اس تمام گفت وشنید کے دوران محمد علی اب تک خاموش رہے تھے۔ ان کی حیثیت اکھاڑے کے باہر بیٹھنے والے شخص کی سی تھی۔ اور اکھاڑے کے اندر خاندانی جھگڑے کو نمٹانے کے لئے کوششیں کی جارہی تھیں۔ مگر جب انہیں یقین ہوا کہ بات چیت تعطل کا شکار ہوگئی ہے۔ تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود معاملے کو نمٹائیں گے۔

اپنے والدین کو بتائے بغیر محمد علی اپنے سسر اور خوش دامن سے ملنے چلے گئے۔ ان لوگوں

نے رسم ورواج کے مطابق اپنے داماد کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا اور ان کی خوب خاطر و مدارات کی۔ انہیں بتائے بغیر کہ وہ کس مقصد کیلئے ان کے پاس آئے ہیں، محمد علی ان کے ساتھ کچھ دیر بیٹھے رہے۔ ان کی سسرال والوں نے یقیناً سوچا ہوگا کہ ان کا داماد کس قدر مہذب، خاموش طبع اور فرمانبردار ہے۔ استقبال اور خوش آمدید وغیرہ کی رسومات مکمل ہو جانے کے بعد محمد علی نے نہایت پختہ لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ انہوں نے کہا کہ ان کے والدین پانیلی میں مزید قیام نہیں کر سکتے۔ اور انہیں لازمی طور پر کراچی واپس جانا ہے اور یہ کہ وہ خود بھی ان کے ساتھ ہی جائیں گے۔ وہ اپنی دلہن کو بھی ساتھ لے جانا چاہتے ہیں اور یہ کہ انہیں امید ہے کہ دلہن کے والدین کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن اگر انہوں نے گاؤں کے رسم ورواج کے مطابق کوئی فیصلہ کیا تو ٹھیک ہے ان کی مرضی۔ میرے بھائی نے کہا کہ وہ انہیں (اپنے سسرال والوں کو) یہ بتانے آئے ہیں کہ اس صورت میں وہ اپنی بیٹی کو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں اور جب چاہیں اسے کراچی بھجوا سکتے ہیں۔ دلہن کے والدین اس نوجوان کی اپنے سسرال والوں سے اس قدر بے باکانہ گفتگو پر حیران رہ گئے۔ انہوں نے اپنے داماد کو حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے غیر متوقع طور پر مضبوط لہجے اور صاف گوئی پر انہیں بہت حیرت ہوئی۔ تاہم محمد علی نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ وہ جلد ہی تین برس کے لئے کراچی سے یورپ روانہ ہو جائیں گے۔ شاید دلہن کے والدین اسے اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں کراچی بھیجیں اور اسے تین سال تک ان کی انگلینڈ سے واپسی کا انتظار کرنا پڑے۔

نوجوان بیٹا اس مسئلے کو سلجھانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ جس میں اس کے والدین کو ناکامی ہوئی تھی۔ اگلے ہی روز محمد علی کے سسر اور خوش دامن میرے والدین سے ملنے آئے اور بڑی فکر مندی سے پوچھا کہ وہ ایمی بائی کو کب کراچی لے جانا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس کی رخصتی کے لئے

ضروری انتظامات کر سکیں۔ دونوں خاندانوں کے درمیان اختلاف اور تلخی کی جگہ خیر سگالی کی فضا بحال ہو چکی تھی۔

ہماری خاندانی روایت کے مطابق ایمی بائی کو اپنے سسر کے سامنے آنے کے لئے ہر بار گھونگھٹ نکالنا تھا۔ یہ خاوند کے بڑوں کے احترام کی علامت ہوتا تھا۔ مگر اس قسم کے معاملات کے بارے میں محمد علی کے اپنے نظریات تھے۔ ان کی بیوی انکے والدین کی بہو ہونے کے ناطے ان کی بیٹی کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ اور اب وہ ان کے خاندان ہی کی ایک فرد تھی اور صرف اس بنیاد پر بڑوں کے سامنے آنے کے لئے گھونگھٹ نکالنے کا تکلف کرنا کہ ان کی دادی یا نانی ایسا کیا کرتیں تھیں۔ محمد علی کے نزدیک غیر ضروری تھا۔ میرے والد نے بھی اپنے نوجوان بیٹے کے خیالات کی حمایت کی۔ اس روز سے ایمی بائی نے صدیوں پرانی یہ روایت ترک کر دی جو ہمارے خاندان میں نسل در نسل آ رہی تھی۔

میری والدہ بیٹے سے تین برس کی جدائی کے تصور ہی سے کھوئی کھوئی رہتی تھیں، ان کے لئے یہ بہت طویل عرصہ تھا۔ مگر انہوں نے اس جدائی کو محمد علی کی بہتری کے خیال سے قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا: میرے بیٹے میں تم سے جدا ہونا پسند نہیں کرتی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ انگلینڈ جا کر تم بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔ یہ میری زندگی کا خواب ہے۔ ان کا بیٹا خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے کہا: محمد علی تم ایک لمبے سفر پر جا رہے ہو، ایسا لگتا ہے کہ میں تمہیں انگلینڈ سے واپس آتا دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہوں گی اور اس کے بعد وہ سسکیاں لے کر رونے لگیں۔

محمد علی نے جذباتی ہو کر والدہ کو گلے لگا لیا۔ میری والدہ نے بیٹے کو الوداع کہا: محمد علی، خدا تمہاری حفاظت کرے گا۔ وہ میری خواہش کو ضرور پورا کرے گا۔ تم بڑے آدمی بنو گے اور مجھے تم پر فخر ہوگا۔

تاجر سے بیرسٹر بننے تک

قطب نما چارٹوں اور ستاروں کی مدد سے سمندر کی لہروں پر سفر کرنے والا جہاز اپنی منزل انگلستان کی جانب رواں تھا۔ اور میرا بھائی ایک یکسر اجنبی ملک میں نئی زندگی کے بحرِ بیکراں میں داخل ہو رہا تھا۔ چند ایک بچوں کے سوا جو اپنے والدین کے ہمراہ اس جہاز میں سوار تھے، محمد علی اس جہاز کا سب سے کم عمر مسافر تھا۔ **1890**ء کے عشرے میں ایک عام ہندوستانی کی زندگی میں انگلستان کا سمندری سفر نہایت غیر معمولی اور بڑا واقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ ایسے ہی سولہ سال کے اس نوجوان کی تن تنہا بحری جہاز پر موجودگی بہت سے لوگوں جن میں اکثریت انگریزوں کی تھی، کے لئے بڑی حیرت اور تعجب کی بات تھی۔ انگریز مسافروں میں سے ایک اس یکا و تنہا نوجوان پر مہربان ہو گیا۔ جس کی ظاہر شکل وصورت میں لڑکپن کی جھلک بدستور نمایاں تھی مگر جس کے اندر اپنی عمر سے کہیں بڑے شخص کی خود اعتمادی موجود تھی۔ اس انگریز نے محمد علی سے پوچھا کہ وہ کس غرض سے انگلینڈ جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ وہاں کسی کو جانتے ہیں۔ انگلینڈ میں ان کا قیام کہاں ہوگا۔ اور وہ زندگی میں کیا بننا چاہتے ہیں۔ نوجوان محمد علی نے اس بوڑھے انگریز کو

کافی متاثر کیا، جو اس کے ساتھ اپنے بیٹے کا سا برتاؤ کر رہا تھا۔ وہ انگریز روزانہ زیادہ تر وقت میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں گذارتا اور انہیں الندن کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرتا رہتا جو اس کے خیال میں میرے بھائی کے لئے مفید ہو سکتی تھیں۔

اس زمانہ میں بحری جہازوں کو بمبئی سے انگلستان پہنچنے میں تین ہفتے لگتے تھے۔ راستے میں جہاز چند ایک بندرگاہوں پر رکتے تھے۔ اور مسافر اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ساحلوں پر سیر و تفریح اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہو لیتے تھے۔ جہاز جب پورٹ سعید پر رکا تو بوڑھے انگریز نے میرے بھائی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے بٹوے کے بارے میں ہوشیار رہیں، جس میں نقدی تھی۔ اس نے کہا: ''پورٹ سعید پر آپ کو لازمی طور پر محتاط رہنا ہوگا۔ یہاں کے لوگوں کی انگلیاں بہت تیز ہوتی ہیں، وہ آپ کا پرس نکال لیں گے اور آپ کو پتہ تک نہیں چلے گا۔'' محمد علی نے احتیاطی طور پر تھوڑی سی رقم جیب میں رکھ لی۔ اور اس بوڑھے انگریز کی نصیحت کو اپنے احساس ذمہ داری اور چوکسی کے لئے ایک چیلنج کے طور پر قبول کرلیا۔ وہ بظاہر لاپرواہ بنے تنہا پورٹ سعید کی گلیوں میں نکل گئے۔ مگر اندر ہی اندر وہ کسی بھی جیب کترے کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھے اور ہر قدم دیکھ بھال کر اٹھا رہے تھے۔ شام ڈھلے جہاز پر واپس آ کر انہوں نے بوڑھے انگریز کے ساتھ پورٹ سعید، اس کے لوگوں اور سمندری ہواؤں کے بارے میں باتیں کرنے کے بعد آخر میں کہا: ''آپ نے دیکھا سر میرا بٹوہ ابھی تک محفوظ ہے۔ میں بے حد محتاط رہا ہوں۔''

''مائی بوائے! یہ ہوئی نا بات۔ زندگی میں ہر چیز کے بارے میں محتاط رہنا ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔''

مارسیلز کی بندرگاہ پر اترتے ہوئے اس نے میرے بھائی کو لندن میں اپنے گھر کا پتہ دیا اور کہا کہ وہ کبھی کبھار اس سے ملتے رہیں۔ اگلے چار برسوں کے دوران جب یہ بزرگ انگریز

ہندوستان سے واپس اپنے گھر انگلستان آتا تو وہ میرے بھائی کو اپنے گھر دعوت دیتا کہ وہ اس کے اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ کھانا کھائیں۔

محمد علی ساؤتھیمپٹن میں جہاز سے اترے، جہاں سے انہیں لندن جانے والی گاڑی میں بیٹھنا ہوتا تھا۔ جب وہ بگھی میں سوار ہو کر شہر کی وسیع و عریض سڑکوں پر نکلے تو اس پر شکوہ دارالحکومت نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ آخر بگھی اس ہوٹل کے سامنے پہنچ کر رک گئی جس میں انہیں بگھی کے سائیس نے ٹھہرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بہت سستا ہوٹل تھا مگر اس کے باوجود اس میں ایک نجی گھر کا سا آرام اور اچھی عمدہ خوراک میسر تھی۔ وہ ہوٹل کے استقبالیہ میں گئے اور رہائش کے لئے مناسب کمرہ مانگا۔ استقبالیہ کلرک نے اس نوجوان ہندوستانی کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اور ناقابلِ یقین لہجے میں پوچھا: ''نوجوان کیا آپ اس کے واجبات ادا کر سکیں گے۔؟''

''یقیناً، یقیناً۔'' محمد علی نے اعتماد سے جواب دیا۔

''مگر مجھے امید ہے کہ واجبات مناسب ہوں گے۔''

تھوڑی دیر بعد ان کا سامان ہوٹل کے ایک آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

میرے والد نے روانگی سے قبل انہیں لندن میں مقیم دو حضرات کے نام تعارفی خطوط دیئے تھے۔ قدرتی طور پر محمد علی سب سے پہلے ان دونوں حضرات سے ملنا چاہتے تھے مگر انہیں یہ جان کر کافی پریشانی ہوئی کہ وہ دونوں حضرات ان دنوں لندن سے باہر گئے ہوئے تھے۔

سردی اپنے عروج پر تھی اور محمد علی نے محسوس کیا کہ لندن میں زندگی قدرے اداسی کا شکار تھی، وہ اس قدر شدید موسم کے عادی نہیں تھے۔ وہ روزانہ بگھی پر اپنے ہوٹل سے دفتر جانے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انہیں لندن کے بھیگے ہوئے سرد موسم میں کافی فاصلہ

پیدل ہی طے کرنا پڑتا تھا۔ کئی برس بعد انہوں نے مجھے بتایا:

''یہ تجربہ بھی خوب تھا۔ میں جوان اور تنہا تھا۔ اپنے گھر اور والدین سے ہزاروں میل دور ایک ایسے ملک میں مقیم تھا جہاں کی زندگی کراچی کی زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ جس کا میں عادی تھا۔ گراہمز اینڈ کمپنی کے صدر دفتر میں، جہاں میں کام کرتا تھا، چند لوگوں سے علیک سلیک کے سوا میں کسی کو جانتا تک نہیں تھا۔ لندن جیسے شہر کے بڑے پن کا میرے جیسے تنہا شخص پر بہت گہرا دباؤ تھا۔ شدید سردی اور موسلا دھار بارشوں سے میرے پٹھے اور ہڈیاں تک یخ ہو جاتی تھیں اور میں خود کو بہت حد تک تکلیف میں محسوس کرتا تھا۔ مگر پھر میں لندن کی زندگی کا عادی ہو گیا۔ اور میں نے جلد ہی اسے پسند کرنا شروع کر دیا۔''

گراہمز شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی میں جس کا صدر دفتر تھریڈ ینڈل سٹریٹ کے پاس تھا، اس نوجوان نے اپرنٹس کا چارج سنبھال لیا، جو کمپنی کے کراچی میں مقیم ایک تاجر دوست کا بیٹا تھا۔ محمد علی کو ایک کمرے میں چھوٹی سی میز اور کرسی دے دی گئی۔ جہاں بیٹھ کر وہ دفتری ساتھیوں کی مدد سے کاروبار کا نظم و نسق چلانا سیکھا کرتے تھے۔

وہ اپنے ساتھ کچھ نقد رقم لائے تھے، میرے والد نے گراہمز اینڈ کمپنی سے کہا کہ وہ کراچی سے اپنے لندن دفتر میں مزید رقم منتقل کر دیں۔ ان کے بیٹے کے پاس اپنی اپرنٹس شپ مکمل کرنے کے دوران کافی رقم موجود رہنی چاہئے، روپے پیسے کے معاملے میں احتیاط انہیں خاندانی ورثے کے طور پر ملی تھی۔ چنانچہ محمد علی نے لندن میں اپنی رقم رائل بنک آف سکاٹ لینڈ 123- بشپ گیٹ سٹریٹ میں جمع کروادی۔ جلد ہی انہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ انہیں لندن میں کم از کم دو برس ضرور رکنا پڑے گا۔ اس لئے ہوٹل میں ٹھہرنا مالی لحاظ سے سستا نہیں رہے گا۔ اور یہ کہ اگر وہ کوئی ایسا خاندان تلاش کر لیں جو انہیں اپنے ساتھ ادائیگی کرنے والے مہمان کی حیثیت سے رکھ لے تو اس پر بہت کم اخراجات ہوں گے۔۔۔ لندن کے روزناموں کے مختصر

اشتہارات کے کالموں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے چند ایک خاندانوں کے پتے نوٹ کر لئے جو پیئنگ گیسٹ رکھنے پر آمادہ تھے۔ اس قسم کے کئی گھرانوں سے ملاقات کرنے کے بعد انہوں نے مسز ایف ایچ ڈریک کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ان کا مکان 35 رسل روڈ کینسنگٹن میں موجودہ وسیع و عریض اولمپیا بلڈرز کے بالمقابل ہائی سٹریٹ کینسنگٹن میں واقع تھا۔ اولمپیا بلڈنگ 1892ء سے کہیں بعد میں تعمیر ہوئی تھی۔ آج بھی یہ جگہ لندن میں رہائش کے لئے بہت مناسب ہے جو ایف سی ریلوے لائنوں کے سیکشنوں اور کراس سیکشنوں سے بلندی پر کینسنگٹن کے مرکزی علاقے میں واقع ہے۔ 1890ء کے عشرے میں یہ لندن کے رہائشی علاقوں کی ان چند جگہوں میں شامل ہوگی، جہاں رہائش کے متلاشی لوگ اکثر آتے رہتے ہوں گے۔ چند سال پہلے لندن کاؤنٹی کونسل نے اس بلڈنگ پر ایک یادگاری تختی نصب کرادی تھی جس پر یہ عبارت تحریر ہے:

''قائداعظم محمد علی جناح (1876-1948ء) بانی پاکستان نے یہاں 1895ء میں قیام کیا۔''

ان کا متجسس ذہن اس وقت انگلینڈ میں اپنے قیام سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جبکہ برطانوی آزاد خیالی اپنی قوم کے ذہنوں پر گہرا اثر مرتب کر رہی تھی۔ انہوں نے اٹھتے ہی صبح کے اخبار بڑی احتیاط سے پڑھنے اور اپنا ناشتہ ختم ہونے سے پہلے انہیں پڑھ لینے کی مخصوص انگریزی عادت اپنالی تھی۔ وہ بڑے لیڈر جو انگلینڈ کے سیاسی افق پر چھائے رہے، محمد علی ان کی کامیابیاں اور پارلیمنٹ اور پارلیمنٹ سے باہر ہونے والی ان کی تقریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے۔ جو لاکھوں دوسرے افراد بھی بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتے، ان ہی سیاسی لیڈروں کے تازہ ترین بیانات اور تقاریر کے بارے میں گفتگو ہوا کرتی تھی جنہیں عام لوگ اس

عہد کی تاریخ کے تقدیر سازوں کی حیثیت سے دیکھتے تھے۔ اور یہاں حال یہ تھا کہ محمد علی تھریڈینڈرل کے قریب واقع گراہمز اینڈ کمپنی کے دفتر میں معمول کے خشک اور اکتا دینے والے دفتر کام میں صبح سے شام تک الجھے رہتے تھے۔ اس تمام تر محنت، مشقت اور صبر کا شاید واحد انعام یہ مل سکتا تھا کہ وہ بالآخر اپنے والد کے کاروبار میں شامل ہو جاتے، اور اسے اس معیار سے زیادہ منافع بخش اور وسیع تر بنانے لگ جاتے جس پر انہوں نے اسے سنبھالا تھا۔ ان کے نزدیک زندگی کا یہ انتہائی بور اور محدود مستقبل تھا۔ ان کی زندگی میں روپے پیسے کی اہمیت ضرور تھی مگر موجودہ صورت میں وہ اپنی قوم کے رہنما نہیں بن سکتے تھے۔ اور نہ ہی وہ اپنے ہم وطنوں کی زندگیاں بہتر بنانے والے ہیرو بن سکتے تھے۔ اس خیال نے ان کے ذہن میں بہت سے شکوک وشبہات پیدا کر دیئے تھے۔ کہ آیا انہیں ایسے کیریئر میں جانے کیلئے خود کو تیار کرنا چاہئے۔ جو ان کے ساتھ ہی شروع ہو اور ان کے ساتھ ہی ختم ہو جائے۔ انہوں نے انگریزوں کی عوامی زندگی کے موجودہ اور ماضی کے لیڈروں کی زندگی کا مطالعہ کرنا اور ان کے بارے میں لوگوں سے بحث کرنا شروع کر دیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان رہنماؤں میں سے اکثر بیرسٹر تھے اور یہ کہ قانون کے مناسب اور خاطر خواہ علم نے انہیں عوامی زندگی میں اہم مقام حاصل کرنے میں بڑی مدد دی تھی۔

اب وہ دوراہے پر کھڑے تھے۔ کیا انہیں بحیثیت اپرنٹس گراہمز میں کام کرتے رہنا چاہئے یا وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے لندن کی کسی انز میں داخلہ لے لیں اور بیرسٹر بن جائیں۔ انہوں نے بتایا: ''مجھے یہ فیصلہ کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ مجھے بیرسٹر بننے کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ میری خوش قسمتی کہ جس سال ''لٹل گو'' کا امتحان پاس کر کے بار ایٹ لاء میں داخلہ لینے کا آخری موقع تھا۔ نئے سال سے داخلے کے قواعد وضوابط میں تبدیلیاں کی جا رہی تھیں، جس

کے باعث بار ایٹ لاء میں داخلہ لینے کی اہلیت حاصل کرنے میں مجھے مزید دو برس لگ جاتے ۔ چنانچہ میں نے لٹل گو کا امتحان پاس کرنے کے لئے گراہمز میں اپرنٹس شپ کا سلسلہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا۔''

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے مستقبل کے بارے میں ان کا یہ فیصلہ انتہائی اہم تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جوان کی زندگی کا دھارا بدل دینے والا تھا۔ ان کے نوجوان ذہن میں بلند نظری اور کچھ کر گذرنے کا شعلہ پیدا ہو چکا تھا اور وہ اپنے ملک کی عوامی زندگی میں اپنے لئے خود جگہ بنانے کا تہیہ کر چکے تھے۔ چنانچہ اس موقع کے حصول کے لئے انہوں نے اپنا تمام تر وقت اور توانائیاں وقف کر دیں۔ ان کی دنیا اب یکسر بدل چکی تھی اور وہ اپنی کتابوں کے ساتھ گویا چپک کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی محنت کا صلہ انہیں جلد ہی مل گیا۔ انہوں نے ''لٹل گو'' کا امتحان نمایاں انداز میں پاس کیا اور بار ایٹ لاء کرنے کے لئے لنکز ان میں داخلہ لے لیا۔ لنکز ان میں داخلہ لینے کی وجوہات بیان کرتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا:

''یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ''لٹل گو'' کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ میں نے یہ امتحان پاس کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں یہ امتحان پاس کر لوں گا۔ میں نے لندن کی تمام انز میں جانے اور ان میں زیر تعلیم طلباء سے ملنے کا سوچا، تاکہ ان میں سے کسی میں داخلے کے لئے اپنے آپ کو پہلے ہی سے تیار کر لوں۔ اپنے استفسارات اور مختلف لوگوں سے تبادلہ خیال کے نتیجے میں میں نے لنکنز کی بجائے ایک دوسری ان میں داخلہ لینے کا دل میں فیصلہ کر لیا۔ لیکن اس کے بعد میں نے لنکنز ان کے صدر دروازے پر دنیا کی نامور قانون ساز شخصیات کے ضمن میں اپنے عظیم پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا نام بھی کندہ کیا ہوا دیکھا۔ چنانچہ اس موقع پر میں نے ایک طرح کی منت مانی یا عہد کیا کہ ''لٹل گو'' میں کامیابی کے

بعد میں لنکنز ان میں داخلہ لوں گا۔

میرے پاس آج بھی ان کی 1892ء سے 1896ء کے عرصے کی وہ بنک پاس بک موجود ہے جس پر انہوں نے ہاتھ سے اپنا نام لکھا تھا: "محمد علی جناح بھائی" رائل بنک آف سکاٹ لینڈ کی اس پاس بک میں ایک ایسا اندراج ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی فیس داخلہ کے لئے 7 جون 1895ء کو لنکنز ان کو 138.19 پونڈ مالیت کا چیک دیا تھا۔ اس طرح سترہ برس کی عمر میں وہ بار ایٹ لاء کی تعلیم حاصل کر رہے تھے، جبکہ کراچی میں میرے والد کو امید تھی کہ ان کا بیٹا جلد ہی لندن سے واپس آ کر کاروبار سنبھالے گا اور اس میں مزید وسعتیں پیدا کرے گا۔

جونہی میرے والد کو پتہ چلا کہ ان کے بیٹے نے لنکنز ان میں داخلہ لے لیا ہے اور اسے بیرسٹر بننے میں تین برس لگیں گے تو میرے والد نے انہیں لکھا کہ وہ اس غیر منافع بخش کام کو ترک کر کے فوراً گھر آ جائیں، سخت الفاظ پر مبنی خط کے باوجود جواب میں بھائی نے ملتجیانہ انداز میں والد صاحب کو لکھا کہ انہیں انگلینڈ میں بار ایٹ لاء کی تعلیم مکمل کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ انہوں نے مزید یقین دہانی کراتے ہوئے والد کو لکھا کہ ان کی تعلیم کے لئے مزید رقم بھجوانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ وہ انگلینڈ میں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ کام بھی کریں گے اور اپنے اخراجات کو کم سے کم رکھیں گے۔ تا کہ والد صاحب نے ان کی دو سال تربیت کے لئے جو رقم دی تھی، اس سے چار سال تک کے اخراجات پورے کئے جا سکیں، اگرچہ میرے والد اپنی مرضی کے مالک بیٹے کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے۔ تاہم انہوں نے اس صورتحال سے سمجھوتہ کر لیا اور بہتری کی دعا اور امید کرنے لگے۔ قائداعظم کے کراچی سے انگلینڈ جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد ان کی بیوی ایمی بائی انتقال کر گئیں۔ محمد علی اپنی کمسن دلہن کے ساتھ زیادہ طویل عرصہ تک نہیں رہے تھے جس کے ساتھ انہوں نے والدین کے کہنے پر شادی کی تھی، اس لئے انہیں اپنی اہلیہ کے انتقال کا بہت زیادہ صدمہ نہیں ہوا

تھا۔ مگر لنکنز ان میں تعلیم کے دوران جب انہیں ان کی والدہ کے انتقال کی خبر ملی، جو میرے سب سے چھوٹے بھائی بندہ علی کی ولادت کے بعد رحلت کرگئی تھیں، تو یہ صدمہ محمد علی کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ مرحومہ ماں کے لئے گھنٹوں سسکیاں لے لے کر روتے رہے جو انہیں دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر تھیں۔ ان کی حساس طبیعت بے حد غمگین ہوگئی اور یہ صدمہ انہوں نے نہایت شدت سے برداشت کیا۔ وہ گھر سے بہت دور تنہا تھے اور والدہ کے آخری دنوں میں ان کے پاس نہیں رہ سکے تھے۔ اس صدمے سے ان کا بہت برا حال ہوا۔ اور انہیں بے ہوشی کا شدید دورہ پڑ گیا۔ آخر کار ان کی والدہ کا وجدان درست نکلا۔ اور ان کی پیش گوئی پوری ہو کر رہی۔ وہ اپنے چہیتے بیٹے محمد علی کو لندن سے کراچی واپسی سے پہلے ہی انتقال کر گئیں۔ قائد اکثر بڑی محبت سے اپنی والدہ کی پیش گوئی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ کہ ایک دن وہ بڑے آدمی بن کر رہیں گے۔ ایک گمنام نوجوان کی حیثیت سے انہیں اکثر حیرت ہوا کرتی تھی کہ کیا ان کی والدہ کی پیش گوئی کبھی واقعی پوری ہو سکے گی۔ کیونکہ ابھی تک ان کی زندگی گمنامی میں گذر رہی تھی اور وہ نہیں جانتے تھے کہ مستقبل نے ان کیلئے اپنے دامن میں کیا کچھ چھپا رکھا ہے۔

میری والدہ کے انتقال کے بعد میرے والد کے کاروبار کو یکے بعد دیگر دھچکے لگنے شروع ہوگئے اور یہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا اور زوال پذیر ہونا شروع ہوگیا۔ اب میرے والد قبل از وقت بوڑھے ہوجانے والے ایک رنڈوے شخص تھے۔ جن کے چھ بچے تھے، کچھ جوان ہو چکے تھے اور کچھ ابھی بہت چھوٹے تھے۔ جنہیں دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں صرف محمد علی ان کا سہارا بن سکتے تھے مگر وہ ابھی لندن میں بیرسٹر کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ میرے بھائی کے علم کے بغیر والد نے ان کے نام پر الگ کاروبار شروع کر دیا تھا۔ یہ کاروبار بھی بھاری خسارے میں جا رہا تھا۔ میرے والد بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے ان ہی پریشانیوں

کے بارے میرے بھائی کو دلسوز خطوط لکھے اور میرے بھائی نے لندن سے جواب میں لکھا کہ انہیں پریشا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، وہ ہندوستان واپس آ کر صورت حال کا مقابلہ کریں گے اور والد صاحب کے خاندانی وقار اور نیک نامی کو بچالیں گے۔

بھائی (قائد) کی عمر تقریباً اٹھارہ برس تھی۔ جب وہ اپنی ماں اور اپنی بیوی سے جدائی کا صدمہ برداشت کر چکے تھے۔ اور اب وہ جانتے تھے کہ ان کا بڑا خاندانی کاروبار جسے ان کے والد نے بے پناہ محبت اور جانفشانی سے کھڑا کیا تھا، تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا۔ بعض اوقات زندگی کے بڑے بڑے صدمات اور ٹھوکریں بعض افراد کی غیر معمولی اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیا کرتی ہیں۔ بھائی (قائد) نے اپنے خاندان کا نام اور روشن کرنے کے لئے ان مصائب اور نقصانات کا مقابلہ یونانی فلسفی زینو کے ایک پیروکار کی سی جرات سے کیا اور کامیابی کا عزم کیا اور اب انہوں نے اپنا نام بدل کر "ایم اے جناح" کر لیا۔

بنک کی پاس بک سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مسز ایف ای ایچ ڈریک کو معاوضے پر رہنے والے مہمان کی حیثیت سے دس پونڈ ماہانہ ادا کرتے تھے۔ بعد کے دنوں میں وہ کہا کرتے تھے کہ مسز ییچ ڈریک ایک مہربان بوڑھی خاتون تھی جس کا کنبہ کافی بڑا تھا۔ وہ خاص طور پر ان سے بڑی محبت کرتی تھی اور انہیں اپنے بیٹے ہی کی طرح سمجھتی تھی۔ مسز ڈریک کی ایک انتہائی حسین وجمیل بیٹی تھی، جو قائد کی ہم عمر تھی، خوبرو مس ڈریک میرے بھائی میں بہت دلچسپی رکھتی تھی مگر وہ اس ٹائپ کے نہیں تھے جو اس قسم کے معاشقوں وغیرہ میں خود کو ملوث کرتے جبکہ مس ڈریک میرے بھائی پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ ہر وقت ان کا دل جیتنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ اس کے ساتھ قابلِ احترام حد تک فاصلہ رکھتے تھے۔ مس ڈریک کبھی کبھی اپنے گھر میں مخلوط پارٹیاں بھی منعقد کرتی تھی اور ان میں دوسرے کھیلوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مہمانوں

کے لئے مغربی انداز کے اس خصوصی کھیل کا بھی اہتمام کرتی تھی جس میں کسی خاص جگہ پر چھپنے والے کے پکڑے جانے کی صورت میں جرمانہ کے طور پر بوسہ لینا پڑتا تھا۔ مس ڈریک کی مسلسل کوششوں کے باوجود قائد بوسہ بازی کے اس کھیل میں کبھی شامل نہ ہوئے۔ قائد نے مجھے بتایا "کرسمس کا موقع تھا اور ڈریک خاندان اسے روایتی جوش وخروش سے منا رہا تھا۔ جیسا کہ عیسائی خاندانوں میں رواج ہے۔ آکاس بیلیں گھروں کے دروازوں پر لٹک رہی تھیں۔ جن کے نیچے ان لوگوں کو ایک دوسرے کا بوسہ لینے کی اجازت ہے۔ میں اس رسم سے باخبر نہیں تھا اور اتفاق سے ایک آکاس بیل کے نیچے کھڑا تھا کہ مس ڈریک نے مجھے پکڑ کر گلے لگا لیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کا بوسہ لوں۔ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ ہمارے معاشرے میں نہ تو ایسا کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت ہے۔ مجھے خوشی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس انداز میں پیش آیا تھا، کیونکہ اس روز کے بعد مجھے اس کی نخرے بازی کی الجھن سے نجات مل گئی۔"

لنکنز ان میں تعلیم کے دوران قائداعظمؒ کی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع تر ہو گیا۔ انہوں نے برٹش میوزیم لائبریری کے لئے ایک ریڈر کی حیثیت سے ٹکٹ حاصل کیا اور اپنا وقت اپنے ذہن کو وسیع اور جامع مطالعہ سے مالا مال کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ کبھی کبھی وہ اتوار کی صبح مشہور زمانہ ہائیڈ پارک میں چلے جاتے اور وہاں کے ایک مخصوص گوشے میں حامیانہ انداز میں خطاب کرنے والے مقررین کی تقاریر سنا کرتے جن کے باعث ہائیڈ پارک کے اس حصے کو ایک ادارے کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ان غیر ذمہ دار مقررین کی جذباتی اور بے ربط تقریریں سن کر جو اکثر نہایت مضر انداز میں اپنی ہی حکومت پر تنقید کیا کرتے تھے۔ قائد کو کسی بھی قوم کے لئے آزادیِ اظہار کی اہمیت کا احساس ہوا جس کے بغیر عوام کی آواز گھٹ کر رہ جاتی ہے۔ وہ باقاعدگی سے دارالعلوم، برطانوی پارلیمنٹ کا ایوانِ زیریں، میں جایا کرتے تھے جہاں وہ بے پناہ تعریف و

توصیف کے ساتھ اس زمانے کے آزاد خیال (لبرل) رہنماؤں کی تقاریر سنا کرتے تھے۔ ان میں مسٹر گلیڈسٹون، لارڈ مارلے، مسٹر جوزف چیمبرلین، مسٹر بالفور اور عظیم آئرش محبِ وطن مسٹر ٹی پی او کنور وغیرہ خاص طور سے قابلِ ذکر تھے۔ دارالعلوم میں اکثر آنے جانے کے باعث وہ پارلیمانی جادو بیانی کے فن سے آشنا ہوئے، جو آنے والے برسوں میں ان کا سب سے مضبوط ہتھیار ثابت ہوا۔

سخت محنت کر کے انہوں نے لنکنز ان میں اپنا امتحان دو سال میں پاس کرلیا، اس طرح اٹھارہ برس کی عمر میں بیرسٹر کہلانے والے وہ سب سے کم عمر ہندوستانی بن گئے، مگر اپنی کیپ اور گاؤن حاصل کرنے کے لئے انہیں مزید کچھ عرصے تک انگلینڈ میں قیام کرنا پڑا، کیونکہ ابھی انہیں قواعد کے مطابق ڈنرز (رات کے کھانوں) کی مقررہ تعداد میں شرکت کرنے کی رسم پوری کرنا تھی۔

وہ اس قسم کے طالب علم نہیں تھے جنہیں کوئی امتحان پاس کرنے کے لئے ہمہ وقت کتابوں پر جھکے رہنا پڑتا ہو۔ بحیثیت طالب علم انہوں نے خود کو مختلف سرگرمیوں کے گرداب میں الجھائے رکھا تھا۔ جن میں سے بیشتر کا تعلق انگلستان میں مقیم ہندوستانی طلبہ کی سرگرمیوں سے تھا۔ لندن میں ان کی آمد کے پہلے ہی برس ہندوستانی طلباء میں بے حد جوش وخروش پایا جارہا تھا کیونکہ ایک ہندوستانی نژاد پارسی بزرگ دادا بھائی نوروجی کئی برس پہلے کاروبار کے سلسلے میں بمبئی سے آکر لندن میں آباد ہو گئے تھے۔ ان دنوں میں وہ سنٹرل فنسبری کے انتخابی حلقے سے برطانوی دارالعوام کی نشست کیلئے انتخاب لڑرہے تھے۔ وہ اس قسم کے انتخاب میں حصہ لینے والے پہلے ہندوستانی تھے، یہ فطری امر تھا کہ لندن میں مقیم ہندوستانی طلباء ان کی انتخابی مہم میں جوش وخروش سے حصہ لے رہے تھے۔ قائداعظمؒ نے بھی اس انتخابی مہم میں دل وجان سے حصہ

لیا۔ اس طرح وہ بزرگ ہندوستانی سیاستدان کی نظروں میں آگئے۔ اور دادا بھائی نوروجی کے دل میں ان کے لئے احترام اور پسندیدگی کے جذبات پیدا ہوگئے۔

انتخابی مہم کے ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے میرے بھائی نے مجھ سے کہا:

''جب مجھے علم ہوا کہ لارڈ سالبری نے اپنی تقریر کے دوران دادا بھائی نوروجی کو ''کالا آدمی'' قرار دے کر ان کا مذاق اڑایا ہے اور فنسبری کے ووٹروں سے کہا کہ وہ دادا بھائی کے کالے رنگ کے باعث انہیں منتخب نہ کریں تو میں غصے سے کھول اٹھا۔ اگر دادا بھائی کالے ہیں تو میں ان سے بھی کالا ہوں۔ اگر ہمارے پولیٹکل ماسٹرز کی یہی ذہنیت ہے تو ہم ان سے کبھی انصاف اور منصفانہ طرزِ عمل کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس روز سے میں قطعی طور پر ہر قسم کے رنگ کے امتیاز کے خلاف ہوں۔ میں نے انتقاماً اولڈ مین دادا بھائی نوروجی کیلئے کام کیا، خوشقسمتی سے وہ تین ووٹوں سے جیت گئے۔ اگرچہ دادا بھائی کو بہت ہی معمولی اکثریت سے کامیابی ملی تھی، اس کے باوجود لندن میں مقیم ہندوستانی طلباء کا جوش و خروش نہایت شدید تھا۔ میں نے ہاؤس آف کامنز (دارالعلوم) کی گیلری میں بیٹھ کر اولڈ مین کی سب سے پہلی تقریر سنی تو میں نے اپنے اندر جذبات کی ایک نئی لہر محسوس کی۔''

انہوں نے کہا کہ وہ آزادی تقریر کی برطانوی روایت کے معترف ہیں اور برطانیہ میں اب ایک ایسا ہندوستانی موجود تھا جو آزادی اظہار کے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے اپنے ہم وطنوں کے لئے انصاف کا مطالبہ کر سکتا تھا۔ وہ بالکل درست کہہ رہے تھے۔ آزادی اظہار کے بغیر کسی قوم کی حالت گلاب کے اس پودے کی سی ہے جو ایسی جگہ اگا ہو جہاں نہ اسے دھوپ ملتی ہو اور نہ ہوا۔

قائداعظمؒ کے دل میں دادا بھائی نوروجی کا بے حد احترام تھا اور وہ انہیں بہت پسند کرتے

تھے۔آنے والے برسوں میں ان ہی دادا بھائی نوروجی نے ان کی سیاسی انفرادیت پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ قائد ہندوستانی نژاد بزرگ سیاست دان سے عمر میں بہت چھوٹے ہونے کے باوجود ان کے ایک مخلص دوست تھے۔ان دونوں نے مل کر انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے ابتدائی سالوں میں اس تنظیم کے لئے انتہائی گراں قدر خدمات انجام دیں۔

انگلستان میں ایک طالب علم کی حیثیت سے قیام کے دوران قائدؒ نے محسوس کیا کہ ہندوستانی طلباء کے باہمی رابطے زیادہ قریبی اور عام نہیں ہیں اور اس طرح وہ خود کو موثر انداز میں منظم نہیں کر سکتے۔اپنی موجودہ حالت میں وہ اپنی یا اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندوستانی طلباء ایک ایسوسی ایشن قائم کر کے منظم ہو جائیں اور ان کے اجلاسوں کے لئے ایک مقام مخصوص کر کے ان کا ایک باقاعدہ فورم قائم کر لیا جائے تو اس سے خود ان طلباء کو بہت فائدہ پہنچے گا۔وہ اس خیال کے بانی تھے اور اس کے تحت انہوں نے متعدد طلباء سے رابطہ بھی قائم کیا مگر سب نے اس بناء پر ان کی مخالفت کی کہ کام بہت بڑا ہے اور ان جیسا کم عمر اور ناتجربہ کار طالب علم اس کو نہیں کر سکتا۔تاہم یہ خیال ان کے ذہن میں بدستور موجود رہا۔1913ء میں جب انہوں نے انگلستان کا دورہ کیا تو وہ غیر معروف شخصیت نہیں رہے تھے۔اب وہ ہندوستان کے ایک ممتاز سیاسی لیڈر تھے۔چنانچہ ہندوستانی طلباء نے انہیں رہنمائی اور مشورہ حاصل کرنے کے لئے گھیر لیا۔طلباء نے کیکسٹن ہال لندن میں ایک اجلاس منعقد کیا اور قائد کو اس سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔انہوں نے ہندوستانی طلبہ کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان اور انگلستان میں ہونے والے سیاسی واقعات اور نشوونما کا گہرا مطالعہ رکھیں اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے طلباء کو خبردار کیا کہ وہ اپنی تعلیم کے دوران عملی سیاست میں بالکل حصہ نہ لیں، کیونکہ ابھی وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، انہیں خالصتاً علمی نقطہ نظر سے موجودہ دور

کے سیاسی واقعات اور معاملات کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تاکہ جب وہ عملی سیاست کے میدان میں آئیں تو وہ لوگوں کو باخبر رکھنے اور ملکی ترقی کے لئے کوشاں رضا کاروں کا کردار ادا کر سکیں۔ انہوں نے اپیل کی طلباء خود کو ایک مربوط ادارے کے اندر منظم کریں۔ چنانچہ اس اپیل کے نتیجے میں لندن میں سنٹرل ایسوسی ایشن آف انڈین سٹوڈنٹس قائم کی گئی۔

ان کے وسیع اور ہمہ گیر مطالعے نے انہیں انگریزی زبان کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے روشناس کرادیا تھا۔ ان میں سے بعض کا مطالعہ تو انہوں نے اپنی آخری عمر تک جاری رکھا۔ ان میں سے شیکسپیئر ان کے لئے بے حد دلکشی رکھتا تھا۔ وہ لنڈن تھیٹر کے شوقین تھے، لیکن وہاں اکثر آنے جانے کیلئے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے۔ انہیں تھیٹر کی دنیا کی جگمگاتی مگر مہنگی راتوں سے اپنے آپ کو دور ہی رکھنا پڑا تا کہ وہ روپیہ بچا کر کتابیں خریدیں اور صبر و تحمل سے لنکنز ان میں ہی اپنے بے کیف مطالعہ کی تیاری کریں۔

مختصر بجٹ کی وجہ سے انہیں اپنی آمدنی بڑھانے کے لئے کوئی ملازمت بھی مل جاتی تو وہ اسے خوش آمدید کہتے۔ بعض اوقات وہ الوڈ وکٹوریہ میں شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھنے چلے جاتے۔ جہاں وہ سیکسپیئر کے ڈراموں میں کام کرنے والے ان ایکٹروں کی کشش سے متاثر ہو جاتے، کچھ عرصہ کے لئے تو وہ سنجیدگی سے سٹیج پر کام کرنے کے آئیڈیا سے جی بہلاتے رہے۔ لیکن انہیں جو واحد پیشکش ہوئی، وہ ایک چھوٹا سا کردار تھا۔ یہ پیشکش ایک غیر اہم تھیٹر کمپنی کی طرف سے تھی جو کبھی کبھی سیکسپیئر کے ڈرامے سٹیج کرتی تھی۔ ان دنوں ان کی خواہش تھی کہ وہ اولڈ وکٹوریہ میں رومیو کا کردار کریں۔ لیکن ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا بلکہ یہ خواب زندگی کے وسیع میدانِ کارزار میں بھی تشنۂ تکمیل ہی رہا۔ حتیٰ کہ سرگرم ترین سیاسی زندگی کے ایام میں

جب وہ دل بھر کے کام اور جدو جہد سے تھک کر دیر سے گھر پہنچتے تو وہ شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ لے کر بستر میں لیٹ جاتے اور آہستہ آہستہ پڑھتے ۔بعض اوقات ڈنر کے بعد جب ہم دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھتے تو وہ شیکسپیئر کے ڈراموں میں سے اپنے پسندیدہ پیرے بلند آواز میں مجھے سناتے ۔ مجھے ابھی تک یاد ہے جب وہ شیکسپیئر کا کوئی اقتباس پڑھتے تو ان کی آواز کا رنگ درست اور بھرپور اور اتار چڑھاؤ موزوں ہو جاتا ۔ یہ تو انہی لوگوں کی خصوصیت ہے جنہوں نے سٹیج ایکٹنگ کے فن کی ٹریننگ لی ہو۔

زندگی کے ان چار تشکیل پذیر برسوں میں ان کا جوان ذہن غیر محسوس طور پر ایسے اہم فیصلے کرتا رہا جوان کی زندگی پر اثر انداز ہونے تھے ۔قدرت نے ان کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کا روباری بننا ان کی غیر معمولی ذہانت سے لگا نہیں کھاتا، جہاں زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ ہر سال اثاثے قرضوں اور ذمہ داریوں سے بڑھتے چلے جائیں تا کہ آہستہ آہستہ بہت سی دولت اکٹھی ہو جائے ۔ وہ اپنے آپ کو اس کمتر دنیا کی تنگ گلیوں میں گم نہیں کر دینا چاہتے تھے، بلکہ وہ خود کو برتری اور شہرت کی شاہراہوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے ۔سٹیج کی دنیا کو اپنا لینے کی امنگ کے باوجود انہوں نے اس پیشے کو اپنی بلند پرواز تمناؤں کے مقابلے میں بہت چھوٹی سی خواہش محسوس کرتے ہوئے مسترد کر دیا۔سٹیج پر کام کرنے والا اداکار ناظرین کی محدود سی تعداد سے داد پا سکتا ہے ۔مگر وہ اس سے بہت بڑے پلیٹ فارم پر لوگوں کے ہیرو ہوں گے، جہاں وہ اپنے لاکھوں عوام کے مسلمہ لیڈر ہونگے ۔

لنکنز ان میں ڈنرز کی رسمی کارروائیاں مکمل ہو چکی تھیں ۔ وہاں تقریباً چار سالہ قیام کے بعد وہ انگلینڈ چھوڑ کر کراچی واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے ۔ رائل بنک آف سکاٹ لینڈ کی پاس بک کے اندرونی کور میں ان آخری چار چیکوں کا اندراج ملتا ہے جو انہوں نے لندن سے روانگی سے

قبل مختلف لوگوں کو دیئے تھے۔ انہوں نے پہلا چیک 14 جولائی 1896ء کو مسز ایف ای پیچ ڈریک کو دیا تھا۔ اس کی مالیت تین پونڈ تھی، اور یہ شاید اس خاتون کو معاوضہ پر ٹھہرانے والے مہمان کی حیثیت سے باقی ماندہ واجبات کی ادائیگی اور حساب ختم کرنے کے لئے دیا گیا تھا۔ 15 جولائی کو انہوں نے تین چیک کاٹے، ایک کی مالیت 10-1-71 پونڈ تھی اور یہ چیک انہوں نے نیشنل بنک آف انڈیا لمیٹڈ بمبئی کے نام لکھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ وطن واپسی سے قبل لندن میں ہی کراچی کی بجائے بمبئی میں مقیم ہونے کا فیصلہ کر چکے تھے، دوسرا چیک انہوں نے لندن سے کراچی تک بحری جہاز سے واپسی سفر کے کرائے کی ادائیگی کے لئے تحریر کیا۔ اس کی مالیت 12-18-42 پونڈ تھی، لندن میں تقریباً ساڑھے تین برس قیام کے دوران ان کے بنک کے کھاتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں مجموعی طور پر تقریباً آٹھ سو پونڈ کی رقم جمع کرائی گئی تھی۔ چونکہ وہ ہمیشہ اپنا کیش بنک میں جمع کرانے کے عادی تھے۔ اس لئے بے خوف وخطر یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ قریب قریب وہی رقم ہے جو انہوں نے انگلینڈ میں خرچ کی۔ اس سے ان کے سادہ طرزِ زندگی کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جسے کاروباری حالات میں تبدیلی کے باعث گھر سے وافر رقوم کی فراہمی ممکن نہ رہی تھی، اور روپے کے معاملے میں محتاط ہونا پڑا۔

گھر واپسی کے لئے انہیں ایک بار پھر اسی قسم کے بحری جہاز سے سفر کرنا پڑا جو تین ہفتے میں ہندوستان پہنچا کرتے تھے۔ ان کا مستقبل اتنا ہی پوشیدہ تھا جتنا کہ گہرا سمندر۔ وہ صرف ایک وسیع خاندان کے ان اندیشوں اور پریشانیوں سے باخبر تھے جو ان کے والد کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی تھیں۔ جنہیں امید تھی کہ ان کا بڑا بیٹا جلد ہی یہ ذمہ داری کسی حد تک خود سنبھال لے گا۔ اس کی گھر واپسی ان کے لئے بے حد جذباتی بات تھی۔ کیونکہ جونہی اس کا جہاز سبک رفتار

سے لنگر انداز ہو رہا ہوگا اور اس کی متلاشی نگاہیں کراچی بندرگاہ کی گودی پر منتظر ہجوم پر پڑینگی۔ تو وہ اپنے والد، بھائیوں، بہنوں اور چند ایک رشتے داروں کو تو دیکھ سکے گا، لیکن اسے اپنی ماں وہاں نظر نہیں آئے گی۔ تقدیر اس کے ساتھ کس قدر بے رحم رہی۔ اب جب وہ ایک تابناک مستقبل کے ساتھ بیرسٹر بن کر انگلینڈ سے واپس آ رہے تھے۔ اگر ان کی والدہ وہاں ہوتیں تو وہ اپنے محمد علی پر کس قدر فخر کرتیں۔

گھر پہنچنے کے فوراً بعد میرے والد نے ان کے ساتھ صلاح ومشورہ شروع کر دیا، والد نے محمد علی کو بتایا کہ ان کا خاندانی کاروبر تباہ ہو چکا ہے اور یہ کہ بہت سے کاروباری اداروں کو بڑی بڑی رقوم ابھی تک ان کے ذمہ واجب الادا ہیں۔ ان میں سے بعض نے اپنی رقوم کی واپسی کے لئے ان پر عدالتوں میں مقدمے بھی دائر کر رکھے ہیں۔ یہ صورت حال ان کاروباری سودوں کی بھی تھی جو میرے والد نے محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے نام سے اس امید پر کیے تھے کہ ان کا بیٹا انگلستان سے واپسی پر خاندانی کاروبار کے علاوہ اس فرم کو بھی سنبھال لے گا۔

یہ اس کا اپنا کاروبار ہوگا جو پہلے ہی سے مستحکم اور منافع بخش بنیادوں پر استوار ہو چکا ہوگا، مگر یہ کاروبار بھی فلاپ ہو چکا تھا اور متعدد مقدمات محمد علی جناح بھائی اینڈ کمپنی کے خلاف زیر سماعت تھے۔ محمد علی ایک نوجوان بیرسٹر تھے اور ان کے سامنے خود اپنے خلاف اس قسم کے کمزور مقدمات کے دفاع کا مسئلہ اان کھڑا ہوا تھا۔ والد نے کہا کہ میرے بیٹے میرے تمام خواب ٹوٹ کر بکھر چکے ہیں اور میں نہیں جانتا کہ تم پر اور تمہارے چھوٹے بہن بھائیوں پر کیا بیتے گی۔ میری صحت پہلے ہی بہت خراب ہو چکی ہے، مجھے نہیں معلوم کہ کب تلک زندہ رہوں گا۔"

محمد علی نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں جواب دیا: "ابا جان! آپ فکر نہ کیجئے، میں سخت محنت

کرونگا اور آپ کا اور اپنے کنبے کا خیال رکھوں گا، میں جوان ہوں اور میری ساری زندگی پڑی ہے، میں روپیہ کماؤں گا اور اپنے خاندان پر واجب الادا تمام قرضے اور رقوم ادا کروں گا۔"

میرے والد نے سوچا کہ محمد علی کو کراچی کے کسی کامیاب وکیل کے دفتر میں جونیئر کی حیثیت سے لگا دینا مناسب رہے گا۔ چنانچہ انہوں نے اس غرض سے دو فرموں میں بات بھی کر لی، جو مختلف مقدمات میں ان کی فرموں کی وکالت بھی کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک ہرچند رائے وِش داس اینڈ کمپنی تھی اور دوسری کا نام لال چند اینڈ کمپنی تھا۔ دونوں قانونی فرموں کے سربراہ حال ہی میں انگلستان سے واپس آنے والے اس نوجوان مسلمان بیرسٹر کو اپنے ساتھ شامل کرنے کے خواہاں تھے۔ ان دنوں مسلم اکثریتی صوبہ سندھ میں چند ایک ہی مسلمان بیرسٹر تھے۔ دونوں فرموں کے سربراہوں کو یقین تھا کہ محمد علی ان کے لئے بہترین سرمایہ ثابت ہوں گے، مگر میرے بھائی اس بارے میں پہلے ہی فیصلہ کر چکے تھے۔ کراچی میں پریکٹس کرنے کی بجائے جہاں ان کے خاندان کی کاروبار میں ناکامی کی تلخ پرچھائیں ان کا راستہ مزید الجھا سکتی تھیں۔ وہ بمبئی میں قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کے خیال میں بمبئی ایک ایسا شہر تھا جہاں سخت محنت کرنے والوں کے لئے آگے بڑھنے کے بہت سے اچھے مواقع موجود تھے۔ میرے والد کی بڑی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا کراچی میں ہی پریکٹس کرے جہاں ان کا خاندان بہت سے لوگوں اور گھرانوں کے ساتھ دوستیاں اور تعلقات استوار کر چکا تھا۔ کراچی سے اپنا تعلق یکسر ختم کر کے بمبئی میں نئے سرے سے زندگی کے سفر کا آغاز کرنے میں انہیں کوئی کشش نظر نہیں آتی تھی۔ انہوں نے اپنے دوست اور پڑوسی مسٹر رام جی بھائی پیٹھا بھائی سے کہا کہ وہ کسی طریقے سے ان کے بیٹے کو کراچی میں پریکٹس کرنے کے لئے راضی کرنے کی کوشش کریں۔ رام جی بھائی کی تمام تر کوششوں کے باوجود نوجوان بیرسٹر اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ وہ اپنا

فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ اپنے ہی راستے پر چلنا چاہتا تھا۔ حسبِ معمول وہ زندگی میں رکاوٹوں اور سخت مشکلات کا کٹھن راستہ اپنانا چاہتا تھا۔

اس وقت انہیں اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ بمبئی میں آباد ہونے کا فیصلہ ان کی زندگی کا انتہائی اہم سنگِ میل ثابت ہوگا اور ان کے مستقبل پر ان کے نہایت گہرے اثرات مرتب ہونگے۔ چنانچہ اپنے والد اور بھائی بہنوں کو خدا حافظ کہہ کر وہ بحری جہاز سے بمبئی چلے گئے۔

انہوں نے طویل المعیاد کرائے کی بنیاد پر بمبئی کے اپالو ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا اور پریکٹس کرنے کے لئے اپنا نام بمبئی ہائی کورٹ میں درج کروالیا۔ یہ محض رسمی کارروائی تھی، اسلئے بآسانی مکمل کرلی گئی۔ اصل مشکل یہ تھی کہ وہ اپنے لئے ایک دفتر بنائیں، مقدمات حاصل کریں اور ایک قابلِ اعتماد بیرسٹر کی حیثیت سے شہرت کمائیں۔ انہوں نے تمام تر توجہ اس جانب مبذول کردی۔ یہ نوجوان باوقار انداز کے ساتھ کئی عدالتوں کے برآمدوں میں اکثر آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی چال ڈھال سے صفِ اول کے کسی بیرسٹر کا تاثر ملتا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اسے پہلے مقدمے کی بے تحاشا ضرورت تھی۔ وہ اپنے قائم کردہ تصورات کی دنیا میں بھی منفرد و یکتا نظر آتا تھا۔ جب کہ اسی پیشے میں اس سے کمتر صلاحیتوں کے حامل وکیلوں کے دفتروں میں ایسے موکلین اکثر آتے رہتے تھے، جو منہ مانگی فیس ادا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ فورٹ علاقے یں ایک کمرے پر مشتمل کرائے کے چھوٹے سے دفتر میں کسی موکل کی آمد کے انتظار میں اپنے پاس موجود قانون کی کتابوں کے محدود سٹاک کے مطالعے میں غرق رہتے۔

بمبئی ہائی کورٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانے کے بعد کسی مقدس مذہبی فریضے کی طرح روزانہ عدالتوں کے چکر لگانا اور مہینوں ایک روپیہ کمائے بغیر شام کو اپالو ہوٹل

کے محدود کمرے میں واپس آ جانا، ان کیلئے بہت ہی ناخوشگوار تجربہ تھا، لیکن جب تکلیف دہ مہینے تین کربناک سالون پر دراز ہو گئے۔ تو وہ فی الواقع شکستہ حال ہو گئے۔ اس وقت کراچی میں ان کے والد اور خاندان کو مقدمات اور مشکلات کا سامنا تھا، مگر وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے، یہ صورتحال ان کی توقعات کے قطعی برعکس تھی، جو انہوں نے کراچی سے بمبئی روانہ ہونے سے پہلے قائم کی تھیں۔ مایوسیوں اور ناامیدیوں میں بھی انہوں نے اپنے ٹھاٹھ برقرار رکھے لیکن وہ دل میں اپنی خواہش پوری نہ ہونے کا درد محسوس کرتے تھے۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود کہ جن سے وہ گذر رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے سماجی روابط برقرار رکھے۔ وہ بمبئی کی بہترین کلبوں میں آتے جاتے رہے اور انہیں بمبئی کے معززین شہر کے گھروں میں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں بھی بلایا جاتا رہا، اپنی عمر کی تیسری دہائی کے شروع میں ایک انتہائی پرکشش نوجوان تھے۔ وہ دبلے پتلے اور چھا جانے والی شخصیت کے مالک تھے، ان کی آنکھیں چھوٹی مگر گہرائی تک اتر جانے والی تھیں، جن سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ چہرہ نمایاں یونانی خدوخال لئے ہوئے تھا۔ ہاتھ پاؤں لمبے تھے۔ وہ انتہائی نفیس لباس پہنا کرتے تھے۔ ان کے مجموعی سراپے سے واضح طور پر یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ پیدائش طور پر اپنے ہم جنس انسانوں کے رہنما تھے۔ قدرت نے انہیں دلکش اور باوقار شخصیت عطا کی تھی مگر معاشرے نے انہیں پرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے وسائل فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جدوجہد کے ان دنوں میں جن لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا تھا، وہ انہیں عزم اور حوصلے سے بھرپور نوجوان قرار دیا کرتے تھے، مگر وہ لوگ شاید نہیں جانتے تھے کہ اس بھرپور نوجوان کی جیبیں کس حد تک خالی تھی۔

لیکن غیر ارادی طور پر یہ سماجی تعلقات ان کے لئے ایک نعمت ثابت ہوئے اور کامیابی کا

باعث بنے، انکے ایک قریبی دوست نے جوان کی ذہانت و بلند حوصلگی کا بے حد معترف تھا۔ انہیں مسٹر میکفرسن سے متعارف کرایا جو اس وقت بمبئی کے قائمقام ایڈووکیٹ جنرل تھے۔

مسٹر میکفرسن اس نوجوان بیرسٹر سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے اسے اپنے ماتحت کام کرنے کی دعوت دی۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے محمد علی کو اپنی ضخیم لائبریری سے استفادہ کرنے اور اپنے چیمبرز میں مطالعہ کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ میرے بھائی نے مسٹر میکفرسن کی طرف سے اس بلند جذبے کو ہمیشہ یاد رکھا۔ بالخصوص جیسا کہ اس زمانے میں ایک انگریز کی طرف سے ہندوستانی بیروسٹروں کے ساتھ تواضع کا ایسا اظہار شاذ ہی ہوتا تھا۔

میسٹر میکفرسن نے جل دہی محسوس کرلیا کہ ان کے دفتر میں آنے والا نیا نوجوان بیرسٹر پر کشش شخصیت، قابلیت، مستقل مزاجی اور دیانت داری کے اوصاف کا مالک ہے۔ چنانچہ انہوں نے بعض مقدمات نوجوان مسٹر جناح کو بھجوانا شروع کردیئے۔ اس موقع پر میرے بھائی کے دل میں سرکاری ملازمت کرنے کا خیال پیدا ہوا تاکہ انہیں معقول حد تک مسلسل مالی تحفظ کا اطمینان ہو۔

بار میں کامیابی کی بے یقینی اتنی مہیب تھی کہ اس کا تصور ہی مشکل تھا۔ جب انہوں نے اپنا یہ خیال مسٹر میکفرسن کے سامنے رکھا تو انہوں نے زبردست تائید کرتے ہوئے انہیں محکمہ انصاف کے رکن سر چارلس آرلیونٹ کے پاس بھجوادیا۔ اور دو ہفتوں کے اندر میرے بھائی کا عارضی پریذیڈینسی کی حیثیت سے تقرر ہوگیا۔

انہوں نے محسوس کیا کہ اب تک جو کامیابی ان سے دور رہی تھی، اب مکمل طور پر ان کے ہاتھ آچکی تھی، مجسٹریٹ کی حیثیت سے ان کے مثالی رویئے نے ان کے سنیئرز کو ان کی تعریف کرنے پر مجبور کردیا۔ جب ان کے عارضی تقرر کی معیاد ختم ہوگئی تو سر چارلس آلیونٹ نے ایک

دوسری مگر بہتر عدالتی نوکری کی پیشکش کی۔ جس کی ماہوار تنخواہ پندرہ سو روپے تھی، اور اس زمانے میں بہت بڑی تنخواہ سمجھی جاتی تھی۔ انہوں (قائداعظمؒ) نے جواب دیا: ”نہیں، شکریہ جناب۔ میں جلد ہی اتنی رقم ایک دن میں کمانے لگوں گا۔“ یہ ان کا دندان شکن جواب تھا۔

جب انہوں نے بمبئی پریذیڈینسی کے قائم مقام مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفیٰ دیا تو بہت سے لوگ انہیں اپنا وکیل بنانے کے لئے ان کے پاس پہنچے۔ انہوں نے اپالو ہوٹل میں اپنا مختصر سا کمرہ چھوڑ کو اپالو بندر کے علاقے میں ایک مناسب فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اس کی تزئین و آرائش انتہائی نفاست اور باذوق انداز میں کرائی اروایک بلڈنگ میں اپنا نیا دفتر قائم کیا جس میں بعض دوسرے وکلاء کے دفاتر بھی تھے۔ انہیں اپنے دفتر کو باوقار اور پرکشش انداز کا چیمبر بنانے کے لئے اپنی محدود آمدنی میں سے کوئی پیسہ نہ بچتا۔ جس چیمبر کا مالک بننے پر کوئی بھی وکیل فخر کرسکتا ہے۔ کامیابی کی سیڑھی پر ان کے قدم مضبوطی سے جم چکے تھے، اب انہوں نے میرے والد کو کئی خط لکھے اور تار بھیجے کہ اب وہ پورے خاندان کے ساتھ ان کے پاس بمبئی چلے آئیں۔

میرے والد اپنی شریکِ حیات کو کراچی میں کھو چکے تھے۔ وہ بڑا کاروبار جو انہوں نے اپنے بیٹے کو منتقل کرنے کی نیت سے انتہائی محنت اور جدوجہد کے نتیجے میں کھڑا کیا تھا، برباد ہو چکا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب کراچی میں مزید قیام سے صرف ان کے ذہن میں تلخ یادیں تازہ ہوتی رہیں گی۔ مزید برآں اب جبکہ ان کا بیٹا بمبئی میں اپنے پاؤں پر آسودگی کے ساتھ کھڑا ہو رہا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے اور ان کے خاندان کے لئے بمبئی چلے جانا ہی بہتر رہے گا۔ یوں ہم بمبئی چلے آئے، اور کھڈک میں واقع خوجہ محلے میں دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا۔ میرے بھائی ہم سے ملنے کے لئے اکثر وہاں

آتے رہتے تھے۔ اب وہ اپنے پیشے میں کافی روپیہ کمار ہے تھے جس کے ذریعے وہ آسودہ زندگی بسر کرر رہے تھے اور اپنے خاندان کی مالی مدد بھی کیا کرتے تھے، اپنے تمام بہن بھائیوں کے تعلیمی اخراجات وہی برداشت کرتے تھے۔

انتہائی مشکل اور حوصلہ شکن جدوجہد نے ان کی خوداعتمادی کی چمک کو ماند نہیں کیا تھا۔ نہ ہی مکمل آزادی کی زندگی گذارنے پر ان کا اعتماد متزلزل ہوا تھا۔ اپنے سے بالاتر لوگوں کی سرپرستی اور سینئرز کی جانب سے ڈرانے دھمکانے یا ستائے جانے کے جواب میں ان کا رویہ بدستور جھک جانے یا شکست تسلیم کر لینے کے قطعی برعکس تھا۔ اسی وجہ سے سر چمن لال سیتلواڈ نے لکھا: ’’جناح نے ہمیشہ حتیٰ کہ اپنے جونیئر ہونے کے دنوں میں بھی بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے کبھی فریق مخالف کے وکیل یا جج کو خود پر غائب نہیں ہونے دیا۔‘‘

لوگ اکثر اوقات میرے والد کو بتایا کرتے تھے کہ ان کا بیٹا اپنی حد سے بڑھتا جارہا ہے اور یہ کہ اس کا ظاہری گھمنڈ اپنے سینئرز کے ساتھ بار روم اور عدالت کے روبرو تیز مزاجی ان کے عروج ار ترقی ی راہیں مسدود کر کے رکھ دے گی، مگر محمد علی کے بارے میں ابتداء میں پائے جانے والے شکوک وشبہات ختم ہو چکے تھے۔ اور میرے والد کے ذہن میں یہ اعتماد بڑھتا گیا کہ ایک شاندار مستقبل ان کے بڑے بیٹے کا منتظر تھا۔

مسٹر سٹرینگ مین بمبئی بار کے ایک سینئر اور قابلِ احترام انگریز رکن تھے۔ ان دونوں (محمد علی جناح اور سٹرینگ مین) کو ایک مقدمے کے سلسلے میں مشترکہ طور پر وکیل مقرر کیا گیا۔ ایک موقع پر میرے بھائی کو سٹرینگ مین کے چیمبر میں اس کیس پر مشترکہ صلاح مشورے کے لئے جانا پڑا۔ اس زمانے میں انگریزوں کو اپنے ہندوستانی رفقائے کار کے ساتھ تحکمانہ انداز روا رکھنا عام سی بات تھی۔ سٹرینگ مین نے قائد کے ساتھ بات چیت میں ایسا لب ولہجہ اور رویہ اختیار کیا

جو میرے بھائی کے نزدیک توہین آمیز اور حقارت پر مبنی تھا۔ اس روز کے بعد وہ دوبارہ کبھی سٹرینگ مین کے چیمبر میں نہیں گئے۔ حتیٰ کہ عدالتوں کے اندر اور باہر جب کبھی سٹرینگ مین ان کے سامنے آیا تو اس کے ساتھ رسمی علیک سلیک بھی نہیں کرتے۔

بمبئی میں ایک نوجوان وکیل کی حیثیت سے وہ ایک مرتبہ جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش ہو رہے تھے۔ ان کے مخالف وکیل سر چمن لال سیتلواڈ تھے۔ جب قائد دلائل دے رہے تھے، تو جسٹس مرزا نے انہیں ٹوکا اور سرزنش کی۔ قائد نے اس کا برا منایا اور اس کے بعد انہوں نے جج کو ایسے انداز میں مخاطب کرنا شروع کر دیا جسے جسٹس مرزا نے توہین محسوس کیا۔ جج نے نوجوان بیرسٹر کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا: ''آپ کے الفاظ اور لہجہ توہین عدالت کی گرفت میں آسکتا ہے۔ تو پھر جج نے سیتلواڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا: ''مسٹر سیتلواڈ کیا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے۔''؟ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سر چمن لال سیتلواڈ نے اپنی کتاب میں لکھا:

''جج کا مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا انتہائی احمقانہ تھا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا: ''یہ رائے دینا میرا کام نہیں ہے کہ مسٹر جناح نے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں، یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اس بات کا تعین کریں۔ مگر میں مسٹر جناح کے ایک جاننے والے کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا مقصد عدالت کی توہین کرنا کبھی نہیں ہو سکتا۔''

بعد کے برسوں کے دوران اس واقعہ کا یاد کرتے ہوئے قائدؒ نے بتایا: ''اس روز کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بحیثیت وکیل جسٹس مرزا کی عدالت میں کبھی پیش نہیں ہوں گا۔''

قوم یتیم ہوگئی

جب میں کراچی میں اس مزار کی دیواروں کو ایک ایک انچ بلند ہوتے ہوئے دیکھتی ہوں جو میرے بھائی کے جسدِ خاکی کو محفوظ کر دینے کے لئے کھڑی کی جارہی ہیں تو میرے ذہن میں اس المناک دن کی یادیں آجاتی ہیں، جب 11 ستمبر 1948ء کو ہفتہ کے دن میرا بھائی مجھ سے چھن گیا تھا اور میری قوم یتیم ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ میری رفاقت چالیس برس سے بھی زائد عرصے پر محیط رہی تھی۔ اس طویل عرصے کے دوران میں نے ان کی زندگی کو کس طرح دیکھا تھا۔ اس کام کا آغاز کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ میں آج صبح ان کی قبر پر حاضری ہوں۔ ان کے لئے فاتحہ خوانی کروں۔ انہیں پھولوں کا نذرانہ پیش کروں اور ان کے لئے آنسو بہاؤں۔ کیونکہ آدمی جن سے محبت کرتا ہے، جب وہ بچھڑ کر دوسرے جہان میں چلے جائیں تو کوئی انہیں ان چیزوں کے سوا بھلا کیا دے سکتا ہے۔ وہ تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، یہ کتاب ان کی زندگی اور کارناموں، ان کی برسوں کی جدوجہد، رکاوٹوں کے ایام اور کامیابی کے لمحات اور اس

تصور، فلاسفی اور نظریئے کو کھول کر رکھ دے گی۔ جو ان کے مطالبہ پاکستان کی بنیاد تھے۔

جہاں تک اپنے مقاصد میں کامیابی کے حصول کے لئے عزم کرنے کا تعلق ہے، قدرت نے انہیں بے پناہ قوت اور توانائی عطا کی تھی۔ اور اس وصف کو ان کے کے بظاہر ناتواں اور کمزور جسم میں چھپادیا گیا تھا۔ اور یہ جسم ان کے قوت اور صلاحیتوں سے بھرپور سیمابی ذہن اور قوت ارادی کی تیز رفتاری کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے قابل نہیں تھا۔ اس سے بھی زیادہ المناک بات یہ تھی کہ ان کی صحت ایسی نہیں تھی جو بے پناہ مصائب و مشکلات کے مقابلے میں ان کی جدوجہد سے بھرپور زندگی کا ساتھ دے سکتی اور انہیں وہ قوت فراہم کر سکتی کی انہیں ضرورت تھی۔ تا کہ وہ اپنی قوم کی اٹل تقدیر کی جانب رہنمائی کرنے کی راہ میں حائل مشکلات پر قابو پاسکیں۔

زندگی کے آخری دس برس کے دوران ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔ جبکہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاؤں کے باوجود انہوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا۔ وہ آرام کرنے اور اپنے کام میں کمی کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔ وہ زندگی کی توانائی کے باقی ماندہ ذخیرے کو کسی کھلنڈرے بچے کی طرح بے دریغ لٹاتے رہے۔ ان کی خرابی صحت سے خوفزدہ ہو کر میں جب کبھی ان سے طویل اوقات میں اتنا زیادہ کام نہ کرنے کی التجا کرتی یا ہندوستان بھر کے مسلسل طوفانی دوروں کا پروگرام کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دینے کا مشورہ دیتی تو وہ کہتے:

''کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو؟'' انہیں کمال حاصل تھا کہ بنا بنایا مقدمہ ایک جملے میں اڑا دیتے۔ میری بھلا کیا حیثیت کہ انہیں قائل کر سکتی۔ ایسے مواقع پر میں عموماً دلائل کی بجائے

جذبات کا سہارا لیا کرتی تھی۔ میں کہتی: ''آپ کی زندگی بے حد قیمتی ہے اور آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہئے۔'' ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے۔ وہ کہتے: ''فردِ واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے، جبکہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقا کے بارے میں پریشان ہوں، کیا تم جانتی ہو کہ مسلمان قوم کتنے خطرے میں ہے؟'' ان کا یہ کہنا جذبات کو خاموش کردینے کے لئے کافی ہوتا۔ اور اس کے بعد وہ اپنی صحت کو بالکل نظر انداز کرتے ہوئے سیاست کے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے۔

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت فروری 1937ء میں عام انتخابات کروائے جارہے تھے، جن میں آل انڈیا مسلم لیگ پہلی مرتبہ اپنے امیدوار کھڑے کررہی تھی۔ اس مرحلے پر لیگ نہ تو پوری طرح منظم تھی اور نہ ہی اس کا پیغام ابھی مسلمانوں تک پوری طرح پہنچایا جاسکا تھا۔ چنانچہ رائے عامہ کو لیگ کے حق میں استوار اور منظم کرنے کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر آگئی۔ عوام کے اجتماعات اور جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے وہ جس قدر زیادہ سفر کرتے، اسی قدر ان سے مزید جلسوں کے لئے وقت مانگا جاتا۔ ملک بھر کے مختلف شہروں، قصبوں اور دیہات سے انہیں وہاں کے دورے کرنے کی بے پناہ دعوتیں موصول ہوتیں، تاکہ لیگ کا پیغام مسلمانوں تک پہنچایا جاسکے۔ مسلمانوں میں یہ شعور بتدریج پیدا ہوتا جارہا تھا کہ جب تک وہ متحد نہیں ہونگے، ان کا سیاسی مستقبل محفوظ نہیں ہوسکے گا۔

وہ جہاں بھی گئے، میں ان کے ہمراہ ہوتی تھی۔ مسلمانوں کا خوابِ غفلت سے بیدار ہونا انتہائی حوصلہ کا باعث تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جلسوں میں شریک ہونے والے لوگوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ مسلمانوں کے ذہنوں پر نہ صرف مسلم لیگ کا اثر ونفوذ بڑھ رہا ہے، بلکہ محمد علی جناح کی ذاتی مقبولیت میں بھی اضافہ ہورہا ہے۔ جب

وہ یہ کہتے کہ مسلمان ایک بڑی قوت ہیں جو مستقبل میں نافذ کی جانے والی سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں جو مستقبل میں نافذ کی جانے والی سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ یہ متحد ہو جائیں تو اس پر فضا پر جوش نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھتی۔ وہ ایک پر جوش رہنما کی طرح بلند آواز میں کہتے: ''سب کو جان لینا چاہئے کہ مسلم لیگ قائم رہنے کے لئے وجود میں آئی ہے۔ مسلم لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو درہم برہم کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہوں گی۔ مسلمان اپنی منزل کی جانب آگے بڑھ رہے ہیں اور دنیا کی کوئی طاقت ان کو کامیاب ہونے سے نہیں روک سکتی۔'' اس قسم کے امید افزاء الفاظ کے ساتھ جب وہ اپنی تقریر ختم کرتے تو ہجوم بے اختیار نعرے لگانے لگتا۔ ''مسلم لیگ زندہ باد۔ محمد علی جناح زندہ باد۔''

1940ء میں جب سے مسلم لیگ نے لاہور میں اپنی قرارداد منظور کی تھی جو قرارداد پاکستان کے نام سے معروف ہوئی، تب سے کام کی زیادتی کے باعث وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کا بھی خیال نہ رکھتے۔ ان کی واحد قوت ان کے منتشر اور غیر منظم پیروکار تھے۔ انہوں نے اس برس (1940) سے انسانی تاریخ کے ایک عظیم باب کی حیثیت سے قیام پاکستان کے مطالبے کو عملی شکل دینے کا بیڑہ اٹھایا۔ ایک سیاستدان کو اپنی جدوجہد کے دوران بے پناہ سفر کرنا پڑتا ہے، طویل اور تکلیف دہ حالات میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور یہ امور ان کی صحت پر بہت گراں تھے۔ مگر انہوں نے ان سب مصائب و مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ پانچ فٹ ساڑھے دس انچ قد کے ساتھ ان کا معمول کا وزن 112 پونڈ تھا۔ مگر اب ایک ایک اونس کر کے ان کا وزن کم ہو رہا تھا۔ وہ اپنی صحت اور اسی قسم کے دیگر ذاتی معاملات سے قطعی بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کے نجی معاملات ان کے کام میں حائل ہوں۔ مین نے ایک

بار پھر انہیں دلائل سے، اور التجاؤں کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ قابلِ ارادوں کے آگے بند باندھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جوان تمام رکاوٹوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے جوان کی قوم کی راہ میں حائل تھیں۔

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے کے علاوہ انہیں مرکزی مجلسِ قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی لیڈر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ گذشتہ کئی روز سے انہیں بخار ہو رہا تھا، اس کے باوجود ہم نومبر 1940 میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ وہ رات کا کھانا کھا چکے تھے اور ٹرین تاروں بھرے صاف شفاف آسمان کے نیچے تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ تھی۔ وہ بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک زور سے چلا اٹھے۔ جیسے کسی نے لوہے کے سرخ دہکتے ہوئے ٹکڑے سے ان کا جسم داغ دیا ہو۔ میں جلدی سے ان کے پاس پہنچی اور ان کے اس طرح بلبلا اٹھنے کی وجہ دریادت کی۔ درد کی شدت نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ چنانچہ کچھ کہنے کی بجائے وہ انگلی سے ریڑھ کی ہڈی کے نیچے دائیں جانب صرف اشارہ کر کے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ درد نا قابل برداشت تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ چلتی ہوئی گاڑی میں طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے خیال سے ان کے جسم کے متاثرہ حصے کو آہستہ آہستہ سہلانا شروع کر دیا۔ مگر ایسا کرنے سے ان کی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ مجھے امید تھی کہ ٹرین کسی سٹیشن پر رکے گی تو متاثرہ حصے کی ٹکور کرنے کے لئے گرم پانی کی بوتل مل جائے گی۔ وقت گذرتا رہا۔ یہاں تک کہ ٹرین کے بریکوں کی چرچراہٹ سنائی دینے لگی اور بالآخر گاڑی ایک سٹیشن پر رک گئی۔ میں نے گارڈ سے کہا کہ وہ فوراً گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کرے اور اسے ہمارے کمپارٹمنٹ

میں بھجوادے۔ بوتل آگئی تو میں نے اسے ایک نیپکن میں لپیٹ کر درد والی جگہ پر آہستہ آہستہ ٹکور کرنا شروع کی اور یہ جان کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس سے درد کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

ٹرین علی الصبح دہلی پہنچی اور جلدی ہی ہم اپنی رہائشگاہ 10 اورنگ زیب روڈ پہنچ گئے۔ میں نے اپنے بھائی کو کار سے بستر تک لے جانے میں ان کی مدد کی۔ اور میں نے ٹیلی فون پر ڈاکٹر کو بلایا، تفصیلی چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ قائداعظمؒ کے پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آ گیا ہے اور انہیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی طور پر آرام کرنا چاہئے۔ جونہی ڈاکٹر گیا میرے بھائی نے مجھ سے کہا: ''کس قدر بدقسمتی کی بات ہے، یہ اجلاس بہت اہم ہے، میری وہاں موجودگی نہایت ضروری ہے اور ایک میں ہوں کہ بستر میں جبری آرام کی عیاشی کا پابند کر دیا گیا ہوں۔'' وہ صرف دو روز تک بستر میں رہے، اس کے بعد دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک مختلف اور بے چین شخص تھے جو اپنی قوم کی تاریخ کے پریشان دور میں پیدا ہوئے تھے۔

یہ سنٹرل اسمبلی کا نہایت اہم اجلاس تھا۔ اور جنگ میں ہندوستان کی شرکت کے ضمن میں مسلم لیگ کا موقف بیان کرنے کی ذمہ داری ان پر آن پڑی۔ جب میں نے معزز مہمانوں کی گیلری میں سے انہیں ایوان میں اپنی نشست سے خطاب کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہوئے دیکھا تو میں حیران ہو رہی تھی کہ کیا واقعی وہ اپنی تمام تر توانائیاں جمع کر لینے کے باوجود چند منٹ سے زیادہ تقریر کر سکیں گے۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز ایسے لہجے اور انداز سے کیا جس سے تھکن نظر آ رہی تھی۔ مگر جب انہوں نے اپنے دلائل کا آغاز کیا تو تھکاوٹ کے تمام آثار یکا یک غائب ہو گئے۔ وہ جلد ہی اپنے اصل رنگ میں آ گئے اور انہوں نے مسلمانوں کو بہلانے کے لئے حکومت کی جانب سے کئے جانے والے پراپیگنڈا کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے انہوں نے کہا: ''یقیناً آپ بہت پراپیگنڈا کر سکتے ہیں، مگر

بعض ایسی چیزیں ہیں جنہیں آپ محض خوف وہراس پھیلا کر حاصل نہیں کر سکتے۔''

انہوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: ''کمزور فریق کو لیکچر دینا فیشن بن چکا ہے، اور آپ کمزور فریق کو لیکچر دینے کی پوزیشن میں ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر ہم یقیناً ایسے اخراجات کی فراہمی کے حق میں ووٹ نہیں دے سکتے جو ہم مہیا نہیں کر سکتے جن میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہو یا جن پر ہمارا کنٹرول نہ ہو۔''

انہوں نے گرم جوشی سے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: ''اگر کانگریس گورنمنٹ کو شکست دینے میں کامیاب ہوگئی تو اس میں میرا کیا قصور۔ قصور تو آپ کے آئین کا ہوگا۔ یہ آئین تم نے تیار کیا اور تم بے لچک اور دقیانوسی حکومت کئی دہائیوں سے اس پر عمل کئے جا رہی ہو، اور تم اسے دونوں طریقوں سے نہیں اپنا سکتے۔ یہ ہے تمہارا آئین جو تم نے خود ہی بنایا ہے۔

میں اس ایوان میں برملا کہتا ہوں کہ آج تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ طے نہ پانے کی وجہ (کانگریسی رہنماؤں سے معذرت کے ساتھ) یہ رہی ہے کہ کانگریس خالصتاً ایک ہندو تنظیم ہے خواہ ان کا بیان کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اور یہ کہ ہندو اور کانگریسی لیڈروں کے دماغ کے آخری گوشے میں ہمیشہ یہ بات موجود رہی ہے کہ مسلمانوں کو بالآخر کانگریس کے دام اور ہندو راج کے تسلط میں آنا ہی پڑے گا اور یہ کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور اقلیت کے لئے وہ صرف تحفظات ہی کا مطالبہ کر سکتے ہیں، مگر میں کانگریسی حضرات اور کانگریس پارٹی کے نیشنلسٹ ارکان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے پاس ہمیشہ اس بات کے ٹھوس دلائل اور موجود رہے ہیں۔ اور اس بات میں گذشتہ پچیس برس کے دوران کوئی تبدیلی نہیں آئی۔۔۔۔۔ کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں۔''

اس پر مسٹر ایم ایس اینے نے انہیں زچ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: ''کم از کم

1920ء سے پہلے تو مسٹر جناحؒ کے خیالات یہ نہیں تھے۔'' قائداعظمؒ نے جواب دیا:''
1916ء میں لکھنو پیکٹ دو الگ الگ قوموں کے اصول کی بنیاد پر منظور کیا گیا تھا۔''

مسٹر اپنے اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے اور انہوں نے غصے سے چلا کر کہا:''میں وہاں موجود تھا۔'' قائداعظمؒ یہ سن کر پرسکون انداز میں کھڑے رہے اور پھر انہوں نے نہایت نرمی سے فرمایا:''ہوسکتا ہے میرے دوست اس وقت وہاں موجود ہوں مگر تب کسی نے ان کا نام تک نہیں سنا تھا۔'' اس سخت جملے نے عام حالات میں کبھی نہ دبنے والے مسٹر اپنے کو خاموش کر دیا۔

قائداعظم تقریباً ایک گھنٹہ بولے اور وہ بدستور کھڑے تھے۔ جبکہ میں ان کی صحت کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھی جو ہرگز اطمینان بخش نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے انہوں نے ان الفاظ کے ساتھ اپنی تقریر ختم کر دی۔

''بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی تقریر میں صرف دو چیزوں پر زور دیا ہے، جمہوریت، جمہوریت، جمہوریت اور قومی حکومت کا قیام۔ مگر اس کا فائدہ؟ یہ کابینہ خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، یہ قانون ساز اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگی جس میں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی منتخب ارکان کی دو تہائی اکثریت کی قیادت حاصل کر سکتے ہیں۔ جذبۂ ترحم اس شخص کے ساتھ ہوگا جو کابینہ میں موجود ہونے کے باوجود کانگریس کی قیادت اور اسکی ہدایات سے آزاد رہے گا۔''

جب ہم اسمبلی سے بذریعہ کار گھر کی جانب جا رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ان کی انگلیاں سگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے تھیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے جا کر بستر میں لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ ان میں لباس تبدیل کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

میرے خیال میں پھیپھڑے کی جھلی پر ورم کا حملہ ہی بالآخر آگے چل کر ان کی موت کا سبب بنا، وہ اس مرض پر قابو پا سکتے تھے بشرطیکہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے۔ اگر انکے کام کرنے

کے اوقات معین اور منظم ہو جاتے۔ اگر وہ آندھیوں اور بارشوں میں باہر نکلنے میں احتیاط کرتے مگر وہ برصغیر کے تقریباً مسلسل دورے پر رہا کرتے تھے۔ اس مرض کے بعد وہ سردی سے الرجک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ سردی کے معمولی سے حملے سے بھی وہ کئی کئی روز بخار اور کھانسی کی اذیت میں مبتلا رہتے تھے۔

چند ماہ بعد اپریل 1941ء میں ہم بمبئی سے مدراس جا رہے تھے جہاں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانہ میں گئے۔ یہ دیکھ کر صدمے سے میرا برا حال ہو گیا کہ وہ چند قدم چلنے کے بعد ٹرین کے چوبی فرش پر نڈھال ہو کر گر گئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا: ''جن کیا بات ہے؟'' ایک روکھی پھیکی اور تھکی ہوئی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی، ''میں بیحد کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔'' انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر خود کو اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی برتھ کی جانب بڑھے۔ خوش قسمتی سے ٹرین چند ہی منٹ کے دوران کسی اہم جنکشن پر پہنچ کر رک گئی، جہاں ہزاروں جوشیلے مسلم لیگی کارکن ''قائداعظمؒ زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور چلا کر کہا: ''شور مت مچایئے، قائداعظمؒ تھکاوٹ اور بخار کے باعث بستر پر ہیں، دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو بلا لایئے۔'' چند ہی منٹ کے اندر ڈاکٹر آ گیا جس نے قائداعظمؒ کا معائنہ کیا، اور بولا: ''جناب! آپ کو معمولی نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں، مگر میں آپ کو کم از کم ایک ہفتہ تک کسی بھی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دوں گا۔ آپ کو ایک ہفتے تک بستر میں مکمل آرام کرنا چاہئے۔''

اب ہم مدراس میں تھے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے

ہزاروں مندوبین جمع تھے۔ قائداعظمؒ اسقدر کمزور تھے کہ پہلے روز کے عام اجلاس سے خطاب نہ کر سکے مگر دوسرے روز انہوں نے صدارتی خطبہ دینے پر اصرار کیا۔ میں نے انہیں اس کے برعکس مشورہ دیا مگر وہ اپنے فیصلے پر مصر رہے۔ اس پر میں نے اس سے مختصر تقریر کرنے کی استدعا کی۔ انہوں نے یقین دلایا: ''ہاں، یہ تقریر بہت مختصر ہوگی۔''

جونہی وہ خطاب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اجلاس پر گہری خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے نوٹس کے بغیر فی البدیہہ تقریر کی۔ انہوں نے ہر نکتے کو وضاحت سے استوار کیا اور انہیں ایسی آسان زبان میں بیان کیا کہ اسے عام شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا۔ خواہ وہ اس دور کی ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے یکسر نابلد ہی کیوں نہ تھا۔ انہوں نے ایک ایسے لیڈر کے انداز مین اپنے خیالات حاضرین تک پہنچائے جو نہ صرف اپنے ذہن کو سمجھتا تھا۔ بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ ان کا خطاب اختصار سے بہرحال کوسوں دور تھا، کیونکہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک تقریر کرتے رہے۔ یہ رہنما جو صاحبِ فراش ہونے کیباوجود اپنے عوام کے پاس جانے کیلئے بے قرار تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی منزل مقصود کی انتہائی جرأت کے ساتھ وضاحت کرر ہا تھا۔ انہوں نے کہا: ''میں آپ لوگوں کو انتہائی واضح طور پر بتادینا چاہتا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی منزل یہ ہے کہ ہم ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مکمل آزاد ریاستوں کا قیام چاہتے ہیں۔ جن میں دفاع، خارجہ امور، مواصلات، کسٹمز، کرنسی اور ایکسچینج وغیرہ جیسے امور حتمی طور پر خود ہمارے ہاتھوں میں ہوں۔ ہم کسی قسم کے حالات میں بھی آل انڈیا نوعیت کا آئین نہیں چاہتے۔ جس کے تحت مرکز میں واحد حکومت قائم کردی جائے، ہم اس پر کبھی راضی نہیں ہونگے۔ میں آپ کو بتادینا چاہتا ہوں کہ اگر ایک بار ہم اس پر راضی ہوگئے تو مسلمان ہمیشہ کے لئے اور قطعی طور پر اپنا وجود کھو بیٹھیں

گے۔۔۔ جہاں تک شمال مغربی اور مشرقی ہندوستان میں ہمارے آزاد علاقوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں ہم نہ تو کسی طاقت اور نہ ہی کسی مرکزی حکومت کے معاون بننا کبھی قبول کرینگے۔"

مجھے ان کی کارکردگی پر فخر تھا، مگر اس فخر کے پیچھے ان کی خرابیِ صحت کا اندیشہ بھی منڈلا رہا تھا، تاہم اس عظیم اجتماع کیبے پناہ جوش وخروش نے ان کے تھکے ماندے جسم کو انتہائی طاقتور ٹانک فراہم کردیا تھا۔ وہ کام کے باعث اپنی کمزوری، تھکن ارو بخار کو بھول گئے۔ قیام پاکستان سے پہلے کے سات سال ان کی زندگی کا مصروف ترین ارو انتہائی ہنگامہ خیز دور تھا۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انتھک اور مسلسل جدوجہد کی اور اس کے جواب میں مسلمانوں نے انہیں اپنی خوشدلی سے وفاداری اور تعاون دیا۔ مسلمانوں نے انہیں محبت سے قائداعظمؒ دی گریٹ لیڈر کے نام سے پکارا۔ اب قائدؒ بھی ہندوستانی مسلمانوں کی نجات کی جدوجہد میں اپنے کردار کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ آگاہ ہوچکے تھے۔ میں جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی دیکھتی کہ وہ بمشکل بستر علالت سے اٹھتے۔ ان کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کے آثار نمایاں ہوتے۔ حالانکہ وہ خاصا سمارٹ لباس پہنتےتھے۔ ہم ملسمانوں کے عالمجلسوں سے خطاب کرنے کے لئے اپنی کار میں روانہ ہوجاتے۔ تمام راستے وہ نہایت خاموش رہتے۔ اس خاموشی کا مقصد خیالات کو مجتمع کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی توانائی کا ایک ایک اونس بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پیروکاروں اور مداحوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی نگاہوں میں تھکاوٹ اور اداسی ہوتی تھی اور وہ دونوں طرف باری باری قدرے جھک جھک جاتے اور اپنے پارٹی کے لوگوں کے سلام قبول کرتے اور انہیں پر جوش جوابی سلام کرتے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگاتی تھیں۔ وہ ڈائس پر چلے جاتے۔ قرآن

حکیم کی چند ایک آیات کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقاریر کے بعد وہ چند قدم چل کر مائیک کے سامنے تشریف لے جاتے۔ اب وہ ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں پرجوش لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے اور اس کے بعد وہ ایسے لب و لہجے اور آواز میں ان سے خطاب کرنے کا آغاز کرتے، گویا ان پر بڑھاپا، خرابیٔ صحت بالکل انداز ہی نہ ہوئی ہوں۔ تقریر میں وقفے کے دوران حاضرین ''قائداعظمؒ زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ وہ اپنی آواز کو عوام کے دلوں میں پیدا ہونے والی امیدوں، امنگوں اور مسرتوں کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے جو اب تک خود کو کھلے آسمان تلے ہولناک اندھیرے کی قید میں محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ قائداعظمؒ کی قوم یہ بات نہیں جانتی تھی کہ ان کا لیڈر کس قدر تھکا ماندہ، مضمحل اور جسمانی طور پر کمزور اور بیمار ہے۔ وہ اپنی قوم کے ہیرو تھے اور ہیرو کے ہیرو پن کو بھلا کون الزام دے سکتا ہے۔؟

گھر واپسی وہ اپنے کمرے میں بے سدھ اور بے جان ہو کر لیٹ جاتے اور ہانپتے ہانپتے سانس لیتے۔ تاریخ کے دوسرے بہت سے مشاہیر کی طرح وہ تنہائی میں زیادہ آرام محسوس کرتے تھے، مگر ان کے اندر دہکتی ہوئی آگ اپنی قوم کے دلوں کو دور سے بھی گرمائے رکھتی تھی۔

خوش قسمتی سے وہ اپنی مرضی کے مطابق سونے کی صلاحیت کے بھی مالک تھے، چنانچہ دن بھر کی پریشانیاں اور تفکرات ان کے تحت الشعور کے باہر تک ہی محدود رہتی تھیں، حتیٰ کہ وہ گہری نیند کی حالت میں بھی ان کے خیالات میں نہیں اتر پاتی تھیں۔ ہر صبح کے ساتھ ان کے نام زیادہ خطوط، تازہ درخواستیں آ جاتیں اور نئے نئے مسائل اور بھاری بھرکم معاملات فیصلوں کے منتظر ہوتے۔

وہ ایک ایسی روح تھے جو خدمت کے لئے بے قرار تھی اور وہ روح ایک ایسے جسم میں تھی جو زیادہ کام اور خرابیٔ صحت سے ٹوٹ چکا تھا۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سی کیفیت طاری رہی، بخار

کے بار بار کے حملوں نے ان کے جسم کو کمزور کر دیا تھا۔

قیام پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور پاکستان 14، 15 اگست کی درمیانی معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ جب ہم گاڑی میں کراچی کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس کی جانب جا رہے تھے تو لوگوں کے انتہائی خوش اور پر جوش ہجوم کو ہرگز خبر نہیں تھی کہ قائد اعظمؒ کس قدر شدید علیل تھے۔ ان کی قوم کیلئے یہ آزادی کا دن تھا اور خود قائدؒ کے لئے یہ تکمیل کا ایک لمحہ تھا۔ منزل آگئی تھی مگر سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر ابھرنے والی اس مملکت کو ابھی کئی بڑے اور سنگین مسائل کا سامنا تھا۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی تقدیر کی کشتی کو ایک محفوظ ساحل تک لے جانے کا کام ان کے ہاتھوں میں تھا اور وہ کام کی کثرت سے تھک چکے تھے۔

میں نے انتہائی افسوس ارو کرب کے ساتھ دیکھا کہ کامیابی کے اس عظیم لمحے میں قائداعظم کی جسمانی صحت کسی بھی لحاظ سے تسلی بخش نہیں تھی، ان کی بھوک برائے نام رہ گئی تھی بلکہ بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ انتہائی توجہ اور محبت سے بنائے گئے کھانے بھی انہیں کھانے کی طلب پر آمادہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی بھر کی اپنی مرضی سے سو جانے کی عادت اب عنقا ہو چکی تھی اور وہ مسلسل کئی کئی راتوں تک بے خوابی کے عالم میں تکیوں پر کروٹیں بدلتے اور جاگتے رہتے تھے۔ ان کی کھانسی پر اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ حرارت بھی اب زیادہ رہنے لگی تھی۔ پاکستان کی سرحد کے اس پار سے مسلمانوں کے قتل عام، آبروریزی، آتش زنی اور لوٹ مار کے خوف زدہ کر دینے والے واقعات نے قائداعظمؒ کے ذہن پر شدید اثرات مرتب کئے تھے۔

جب وہ ناشتے کی میز پر مجھ سے اس قدر بڑے پیمانے پر کئے جانے والے قتل عام کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتیں۔ ہندوستان سے اپنے خوابوں کی سرزمین

پاکستان آنے والے مہاجرین کے مصائب نے ان کے ذہن پر افسردگی طاری کر رکھی تھی اور پھر ابھی پاکستان کا آئین تشکیل دیا جانا تھا۔ جب بھی انہیں وقت ملتا، وہ اپنا ذہن اس جانب مرکوز کر دیتے اور اپنے مطالعہ کے کمرے میں اکثر اس کام میں مصروف ہو جایا کرتے۔ ایسے میں وہ مختلف ملکوں کے دساتیر سے متعلق کتب میں گھرے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ کشمیری مسلمانوں کے مسائل نے بھی ان کے ذہن کو بری طرح متاثر کیا تھا جنہیں ایک غیر ملکی اور ظالم حکمران نے دھوکہ دیا تھا۔ پاکستان اگرچہ دنیا کے نقشے پر معرضِ وجود میں آ چکا تھا مگر ابھی اسے اپنی ہی سرزمین پر اپنی جڑیں مضبوط کرنا تھیں۔ یہی وہ مسائل تھے جن کا وہ صبح، دوپہر اور شام تذکرہ کرتے رہتے تھے، انہیں خدشات اور وسوسوں نے ان کا ذہنی سکون ختم کر دیا تھا اور یہ ڈراؤنے خواب کی طرح انہیں پریشان کر رہے تھے۔

ہماری کراچی میں آمد کے چند روز بعد ان کے اعزاز میں کراچی کلب میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا: ''مس فاطمہ جناح میرے لئے مسلسل امداد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ وہی ہیں۔ ان دنوں میں جبکہ مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کر لے گی، یہ میری بہن ہی تھی، جس نے مجھے حوصلہ دیا اور بہت سی امید افزا باتیں کہیں جبکہ انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ انہوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا۔''

اس وقت بھی ان کے سامعین کو ہرگز کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ان کے لیڈر کی صحت کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔

قائداعظمؒ کی زندگی کا مقصد تکمیل پا چکا تھا اور انہیں مکمل کامیابی بھی نصیب ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود ان کا اپنی کی خدمت کے لئے اور زیادہ کام کرنے کا جذبہ ماند نہ پڑا۔ علالت کے عفریت نے ان کی بہت سی جسمانی طاقت زائل کر دی تھی لیکن ان کے نہ دبنے والے جذبے

نے آزادی کے ساتھ آنے والے مسائل کا مقابلہ کرنے کیلئے ان کا سر بلند رکھا۔ وہ ان مسائل کا سامنا عزم وہمت سے کرنا چاہتے تھے تاکہ انہیں حل کرنے کی کوششیں کر سکیں۔

انہوں نے اپنی صحت کی جانب توجہ دینا بالکل ترک کر دیا تھا۔ ان کی کھانسی اور ہلکے بخار نے مجھے اور بھی زیادہ پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اصرار پر وہ اپنے ذاتی فزیشن ڈاکٹر کرنل رحمٰن سے معائنہ کرانے پر رضامند ہو گئے۔ وہ ڈاکٹروں کی دواؤں سے غیر معمول طور پر پرہیز کرتے رہے میں کبھی اس بات کی وجہ نہ جان سکی کہ آخر ان کی زندگی بھر کی اس عادات کی وجوہات کیا تھیں۔ معائنے کے بعد کرنل رحمٰن نے بتایا کہ انہیں معمولی ملیریا ہے اور وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ قائداعظمؒ نے اپنے ڈاکٹر سے متعدد سوالات اور استفسارات کیے جیسے وہ کمرہ عدالت میں کسی گواہ پر جرح کر رہے ہوں۔ ڈاکٹر کی وضاحت سے مطمئن نہ ہونے کے باعث انہوں نے اس کی تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ ''مجھے ملیریا نہیں ہے۔، مجھے کام کی کثرت نے نڈھال کر رکھا ہے۔'' اس قسم کی صورتحال میں ظاہر ہے کہ آرام ہی سب سے بہترین دوا تھی، مگر آرام کر نہیں سکتے تھے۔ ابھی انہوں نے بہت سے کام کرنے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا: ''میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کر توانائی کا آخری اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کر دوں گا۔ اور جب وہ بھی ختم ہو جائے گا تو میرا کام مکمل ہو چکا ہوگا۔ پھر زندگی نہیں رہے گی۔''

مہاجرین کھوکھراپار کے رستے پاکستان آ رہے تھے اور قائداعظمؒ کیلئے قائم کیے جارنے والے کیمپوں اور دیگر انتظامات کو خود دیکھنے کیغرض سے لاہور میں موجود رہنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے دو راستے تھے یا تو وہ اپنے نصب العین کو پورا کرنے کیلئے اپنا فرض سرانجام دیتے جو انہیں زندگی بھر جان سے زیادہ عزیز رہا تھا یا اپنی صحت کا خیال رکھتے جس کی خرابی سے ان کی

جان بھی جاسکتی تھی۔انہوں نے فرض کی پکار پر لبیک کہنے کا فیصلہ کیا اور ڈاکٹروں کے مشوروں پر کوئی توجہ نہ دی۔محمد علی جناح نے لیڈر محمد علی جناح کے آگے مکمل ہتھیار ڈال دیئے تھے۔اس طرح ہم کراچی میں اپنی آمد کے تقریباً ایک ماہ بعد ستمبر 1940ء میں لاہور روانہ ہو گئے۔ وہاں چند روز قیام کرنے کے بعد ہم لوگ واپس کراچیآ گئے۔کراچی میں بمشکل تین ہفتے قیام کرنے کے بعد ہم لوگ ایک مرتبہ پھر اکتوبر کے آخر میں لاہور چلے گئے۔پاکستان کا حصول قائد کی زندگی اور کام کے لحاظ سے ان کیلئے ایک دور کا اختتام اور دوسرے دور کا آغاز ثابت ہوا۔شروع ہونے والا دوسرا دور بھی اسی قدر اہم تھا کیونکہ اس میں پاکستان کی سلامتی کو مستحکم بنانے کا اہم کام شامل تھا۔وہ بحران کے اس زمانے میں اپنی قوم کو کسی صورت تنہا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔چنانچہ انہوں نے اپنے ساتھ کوئی رعایت یا نرمی روا نہیں رکھی۔پاکستان کی فضاؤں پر محرومی اور مایوسی کیبادل چھائے ہوئے تھے۔وہ اس کی جگہ قوم میں مسرت اور امید کے جذبات پیدا کر دینا چاہتے تھے۔ 30 ستمبر 1947ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہو میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا: ”بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ 3 جون 1947ء کا پلان قبول کرنا مسلم لیگ کی غلطی تھی، میں ایسے لوگوں پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس کے سوا کسی بھی متبادل تجویز کو قبول کرنے کے نتائج اس قدر تباہ کن ہوتے جن کا شاید تصور بھی نہ کیا جاسکتا۔ہم نے اپنی جانب سے اس پلان پر صاف ضمیر اور نیک نیتی کے ساتھ عملدرآمد کیا ہے، وقت اور تاریخ اس بات کو ثابت کر دے گی۔دوسری جانب تاریخ ان لوگوں کے بارے میں بھی اپنا فیصلہ تحریر کر دے گی جنہوں نے دھوکہ دہی اور بدنیتی کے حربوں کے ذریعے فساد اور انتشار کی قوتوں کو اس برعظیم میں کھلا چھوڑ دیا،جس کے باعث لاکھوں لوگ ہلاک ہوئے۔جائیداد اور املاک کو بے پناہ نقصان پہنچا اور لاکھوں لوگوں کو ان کے گھر بار اور ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر

اپنے گھروں سے چلے جانے پر مجبور کر دیا گیا، جو انہیں بہت عزیز تھیں، منظم اور مربوط طریقے سے بے گناہ اور نہتے لگوں کا اس طرح قتل عام کیا گیا کہ اس کے سامنے تاریخ کے بدترین ڈکیٹٹروں ،ظالموں کے بربیرے اور ہولناک مظالم بھی ماند پڑ گئے ۔ ہم ایک سوچی سمجھی اور نہایت گہری سازش کا شکار ہوئے ہیں اور اس کا ارتکاب کرنے والوں نے دیانتداری، جرأت مندی اور وقار کیبجیا دیا صولوں تک کی پرواہ نہیں کی۔ ہم اللہ تعالیٰ کا شکرادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں شر کیان طاقتوں کے خلاف جد جہد کرنے کے لئے ایمان کی قوت اور طاقت عطا فرمائی ہے۔ میں ایک بار پھر کہوں گا کہ اگر ہم قرآن کریم سے رہنمائی حاصل کریں تو انشاء اللہ آخری فتح ہماری ہوگی۔"

تقریر کے دوران انکی آواز جذبات سے کانپنے لگی اور میں نے ان کی زبان سے پہلی مرتبہ موت کا تذکرہ سنا۔

"اس جدوجہد کے ساتھ ساتھ اپنے حوصلے بلند رکھئے، موت سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا مذہب ہمیں ہمیشہ موت کے لئے تیار رہنے کا درس دیتا ہے۔ہمیں پاکستان اور اسلام کے وقار کے تحفظ کی خاطر موت کو جرأت کے ساتھ گلے لگانا چاہئے۔مسلمان کے لئے راہِ حق میں جدوجہد کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کرنے سے بہتر کوئی بچاؤ نہیں.......
اپنا فرض ادا کرتے رہئے اور خدا پر مکمل بھروسہ رکھئے۔ روئے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہیں جو پاکستان کو ختم کر سکے، یہ ہمیشہ قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔"

سربراہ مملکت کی حیثیت سے وہ مہاجرین کیلئے جو کچھ کر سکتے تھے، انہوں نے کیا۔وہ مطمئن تھے کہ ان لوگوں کو مناسب توجہ مل رہی ہے ۔ اس کے بعد ہم لوگ کراچی واپس آ گئے۔ حالات کے جذباتی رخ اور قوم کو درپیش مشکلات نے نہ صرف ان کے جسم بلکہ ان کے

جذبوں اور روح تک کو تھکا دیا تھا۔ وہ ایکبار پھر بیمار ہو گئے۔ اس دوران نو مولود مملکت کی حکومت پر، جس نے اپنا کام ملبے کے ڈھیر سے شروع کیا تھا، ذمہ داریوں کا بوجھ دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ ان کے پاس بہت سی فائلوں کی بوچھاڑ تھی اور وزراء اور سیکرٹری حضرات ان سے ہدایات لینے کے لئے ان کے پاس آتے رہتے تھے، ایسے میں قائدؒ کے لئے آرام و سکون ملنا ناممکن تھا۔

وہ آرام کے دنوں میں بھی سرگرمِ عمل رہتے۔ صوبہ سرحد کے لوگوں سے ان کا وعدہ تھا کہ انہوں نے گذشتہ برس ریفرنڈم میں حیرت انگیز کام کر کے سرحد کو پاکستان میں شامل کرنے کا جو فیصلہ کیا، اس کے اظہارِ تشکر کے لئے وہ بذاتِ خود پشاور کا دورہ کرینگے۔ یہ وعدہ نبھانے کیلئے ہم اپریل 1948ء میں پشاور گئے۔ وہاں ایک بھرپور پروگرام ان کا منتظر تھا۔ 12 اپریل کو اسلامیہ کالج کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

''اس موقع پر میرے ذہن میں قدرتی طور پر سب سے اہم بات تحریک قیامِ پاکستان کے دوران طلباء کی جانب سے میسر آنے والی حمایت ہے۔ خاص طور سے اس صوبے کے طلباء کیمیں واضح طور پر یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گذشتہ برس منعقد کرائے جانے والے ریفرنڈم میں اس صوبے کو پاکستان میں شامل کئے جانے کا جو دوٹوک اور صحیح فیصلہ کیا گیا، اس کے پیچھے بھی طلباء کا بھرپور تعاون کارفرما تھا۔ مجھے خاص طور سے اس بات پر فخر ہے کہ آزادی کی جدوجہد اور قیامِ پاکستان کے لئے کی جانے والی کوششوں میں اس صوبے کے عوام کبھی اور کسی بھی لحاظ سے دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔''

اگلے روز ہم رسالپور گئے جہاں قائد اعظمؒ کو رائل پاکستان ایئر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرنا تھا۔ سمجھوتے کے برعکس پاکستان کو ملنے والا فوجی ساز و سامان ہندوستان نے روک رکھا تھا اور ہماری فضائیہ جہازوں اور دوسرے ضروری ساز و سامان سے

محروم تھی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ آپ کے پاس جہازوں اور دوسرے ضروری ساز وسامان کی کمی ہے، تاہم مطلوبہ آلات اور ساز وسامان خریدنیکیکوششیں کی جارہی ہیں اور جدید جہازوں کی خریداری کیلئے آرڈر دیا جاچکا ہے۔ مگر ٹیم سپرٹ اور انتہائی سخت ڈسپلن کبغیر جہازوں یا افراد کی بڑےسے بڑی تعداد بھی کسی کام نہیں آسکتی۔ میں آپکو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ صرف ڈسپلن اور خود پر اعتماد کر کے ہی رائل پاکستان ایئرفورس پاکستان کیلئے قابلِ قدر خدمات انجام دے سکتی ہے۔''

14 اپریل کو انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سول افسروں کا اجلاس طلب کیا اور ان میں سے اکثر کے ساتھ ملاقات کی۔ وہ ان میں بے تکلفی سے گھل مل گئے اور ایک غیر رسمی گفتگو کے دوران انہوں نے فرمایا: ''میں آپ کو سب سے پہلی بات یہی بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کو کسی سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیۓ، خواہ یہ دباؤ کسی سیاسی جماعت کی طرف سے ڈالا جائے یا سیاسی شخصیت کی جانب سے۔ اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کیلئے لازمیہے کہ آپ کسی قسم کے دباؤ میں نہ آئیں بلکہ قوم اور مملکت کے سچے خادموں کیحثیت سے اپنا فرض دیانتداری اور بے خوفی سے ادا کرتے رہیۓ۔ سول سروس کسی بھی مملت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومتیں بنتی اور شکست کھاتی رہتی ہیں۔ وزرائے اعظم آتے جاتے رہتے ہیں، وزراء حکومتوں میں شامل ہوتے ہیں اور الگ ہوجایا کرتے ہیں، مگر آپ لوگ موجود رہتے ہیں، لہٰذا آپ پر انتہائی اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کسی ایک یا دوسری سیاسی جماعت کی حمایت میں آپ کا ہرگز کوئی کردار نہیں ہونا چاہیۓ۔ اسی طرح آپ کو کسی ایک یا دوسرے لیڈر کی حمایت بھی نہیں کرنا چاہیۓ..... یہی آپ کا کام نہیں ہے، آئین کے تحت جو بھی حکومت بنے اور معمول کے آئینی طریقے سے جو بھی وزیراعظم یا وزیر کی حیثیت سے برسرِ

اقتدار آئے، آپ کا نہ صرف یہ فرض ہے کہ آپ خلوص اور وفاداری کے ساتھ اس حکومت کی خدمت کریں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ آپ اپنی سروس کی اعلیٰ شہرت، اپنا وقار اور عزت و احترام قائم رکھنے کے علاوہ سروس کا استحکام بھی برقرار رکھیں۔ اگر آپ عزم اور دیانتداری کے ساتھ کام شروع کریں گے تو آپ ہمارے نظریات اور ہمارے خوابوں کے مطابق پاکستان کی تعمیر کریں گے..... ایک شاندار مملکت اور دنیا کی ایک عظیم ترین قوم۔"

اس سلسلے میں آپ پر زور دینے کے ساتھ ہی میں سیاست دانوں اور اس ملک کے رہنماؤں پر بھی اسی طرح زور دینا چاہوں گا کہ اگر وہ اآپ کے کام میں مداخت کریں، اور آپ پر سیاسی دباؤ ڈالیں گے تو اس سے بددیانتی، رشوت خوری اور اقرباء پروری کے علاوہ کسی اچھی بات کو فروغ حاصل نہیں ہوگا..... جو خوفناک امراض ہیں اور جن میں نہ صرف آپ کا صوبہ بلکہ دوسرے صوبے بھی مبتلا ہیں..... اگر سیاسی راہنما آپ کے کام میں اس قسم کی مداخلت کر رہے ہیں تو میں کہتا ہوں کہ وہ پاکستان کی خدمت نہیں کر رہے ہیں۔..........

ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے بعض لوگ وزراء کو خوش نہ کرنے کے باعث ان کا نشانہ بنیں۔ میں توقع کرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو، لیکن آپ مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ آپ کوئی غلط کام کر رہے ہیں بلکہ اسلئے کہ آپ صحیح کام کر رہے ہیں، قربانیاں دینا پڑتی ہیں، میں آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اگر ضرورت پڑے تو آپ آگے بڑھیں اور قربانی دیں۔ بلیک لسٹ ہونے اور پریشانی اور مصیبت میں مبتلا ہونے کی صورت حال کا مقابلہ کریں، اگر آپ میں سے چند لوگو بھی اپنی قربانیوں کا موقع دیں، یقین رکھئے ہم بہت جلد اس کا علاج ڈھونڈ نکالیں گے۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر آپ اپنے فرائض اور ذمے داریاں مملکت کے ساتھ دیانت داری، خلوص اور وفاداری کے ساتھ انجام دیتے ہیں تو آپ بلیک لسٹ میں نہیں رہیں گے۔ آپ ہی

ہمیں ایک ایسی طاقتور مشینری کے قیام کا موقع فراہم کر سکتے ہیں جو آپ کو تحفظ کا مکمل احساس فراہم کر سکے.... آپ کو ایک فضا قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور ایسے جذبے سے سرشار ہو کر کام کرنا چاہئے کہ ہر شخص کے ساتھ انصاف اور دیانتداری پر مبنی سلوک کیا جا سکے۔ محض انصاف ہی نہ کیا جائے، بلکہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔''

چند روز بعد انہوں نے پشاور میں ایڈورڈز کالج کے سٹاف اور طلباء سے خطاب کیا۔ انہوں نے وہ دن یاد دلایا، جب 1937ء میں انہیں اس صوبے سے نکال دیا گیا تھا۔ انہوں نے صوبہ سرحد مین مسلم لیگ کی شکست کا واقعہ یاد دلاتے ہوئے اس تبدیلی کا ذکر کیا جو گذشتہ دو تین برس کے دوران صوبے میں رونما ہوئی تھی۔ انہوں نے بہادر پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے زبردست اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ خطاب کے آخر میں قائد نے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ آزاد خود مختار مملکت کے شہریوں کی حیثیت سے آپ سر بلند کر کے چلیں۔ جب آپ کی حکومت تعریف کی مستحق ہو تو آپ اپنی حکومت کی تعریف کریں، اور جب تنقید کرنے کا موقع ہو تو اس پر بے خوفی سے تنقید کریں۔۔۔ جب کوئی غلط کام ہو تو آپ بے خوفی سے تنقید کریں، میں تنقید کا خیر مقدم کرتا ہوں۔۔۔ اس طریقے سے آپ ہمارے اپنے عوام کے مفاد کے لئے زیادہ تیزی سے معاملات بہتر کر سکیں گے۔''

پشاور میں منعقد کئے جانے والے جلسہ ہائے عام میں سے ایک کے دوران آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھا گئے۔ جلسہ شروع ہوا تو بوندا باندی ہونے لگی مگر بارش ہونے کے اندیشے سے بے نیاز ہزاروں لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اسی طرح بیٹھے رہے۔ میرے بھائی ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے حالانکہ میں نے جو ان کے برابر ہی بیٹھی تھی، انہیں مشورہ دیا کہ ہمیں اب لازماً چلنا چاہئے۔ وہ بارش سے بری طرح بھیگ گئے، اس کے باوجود وہ جلسے کی مکمل

کارروائی کے دوران اسی طرح بیٹھے خراب موسم کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس رات انہیں زکام ہوگیا، سردی لگ گئی اور کھانسی کے ساتھ شدید بخار ہوگیا۔ انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کے لئے میرا مشورہ مسترد کرتے ہوئے کہا: ''کچھ بھی تو نہیں ہے، بس ذرا سردی لگ گئی ہے، میں اس پر قابو پالوں گا۔''

مگر وہ اس پر کبھی قابو نہ پا سکے۔ جب ہم کراچی واپس پہنچے تو ان کی کھانسی شدت اختیار کرتی گئی، اور جب اصرار کر کے ایک ڈاکٹر کو ان کا معائنہ کرنے کے لئے کہا گیا تو پتہ چلا کہ ان پر برونکائٹس (نرخرے وحلق کا ورم) کا معمول حملہ ہوا ہے، اگرچہ اس کے باعث وہ چند روز تک بستر میں لیٹے رہے، مگر اس کے باوجود ان فائلوں کا باقاعدگی سے مطالعہ بھی کرتے رہے جو انہیں بھیجی جاتی تھیں۔

تقریباً چھ ہفتے بعد وہ نسبتاً بہتر محسوس کر رہے تھے، تاہم کمزوری ابھی باقی تھی۔ میں انہیں مسلسل مشورہ دے رہی تھی کہ وہ کراچی سیباہر پاکستان میں کہیں اور چلے جائیں تا کہ کسی طرح ان کی صحت بحال ہو سکے۔ میرے استدال کی ان کے ذاتی فزیشن ڈاکٹر رحمٰن نے بھی تائید کی جنھوں نے انہیں انتہائی واشگاف الفاظ میں خبردار کیا کہ اگر وہ کم از کم دو ماہ تک کام نہیں چھوڑیں گے اور مکمل آرام نہیں کرینگے تو ان کیصحت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ میں نےسکھ کا سانس لیا۔ جب جون میں ایک روز وہ مان گئے اور انہوں نے ہاں کر دی کہ ہمیں کراچی کی شدید گرمی سے نکل کر کوئٹہ کی خنک بلندیوں پر چلے جانا چاہیئے۔

کوئٹہ آنے کے چند روز کے اندر میں نے دیکھا کیہ ان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہونے لگی ہے، ان کا سونا اور کھانا پینا بہتر ہو گیا تھا، کھانسیکم ہونے لگی تھی اور ٹمپریچر بھی نارمل رہنے لگا۔ اب صرف نہایت اہم فائلیں ہی ان کے پاس بھیجیجاتی تھیں جنہیں انکی توجہ کی فوری

ضرورت ہوتی تھی، کئی سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ طویل آرام کرتے دکھائی دے رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ مختلف تقاریب میں شرکت کی دعوتیں بھی قبول کر لیتے تھے جو کوئٹہ کے شہریوں کے مختلف طبقوں کی جانب سے دی جاتی تھیں۔ ان تقاریب میں وہ پاکستان کے درپیش اہم مسائل کے بارے میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے۔۔۔ مثال کے طور پر کوئٹہ کے پارسی فرقے کی طرف سے پیش کئے گئے سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے کہا: ''معاملات کی نوعیت ایسی ہے کہ پاکستان کے لئے نئے آئین کی تیاری میں اٹھارہ ماہ سے دو برس کا عرصہ لگ جائیگیا۔۔۔'' جب انہوں نے یہ الفاظ کہے تو مجھے یاد آیا کہ آزادی کے بعد کئی مواقع پر انہوں نے مجھ سے تشویش ظاہر کی کہ نیا آئین بننا چاہئے، جو لبرل ہو۔ انہوں توقع تھی کہ اس کی تکمیل پر تقریباً دو سال لگیں گے، وہ کہا کرتے تھے: ''یہ آئین ایک آزاد ملک کے آزاد باشندوں کے شایانِ شان ہوگا۔'' ان کے حساس ذہن کو اس بات سے بڑی الجھن ہوتی تھی کہ ان کی بار بار کی بیماری کے باعث اس انتہائی اہم کام میں تاخیر ہوتی جارہی تھی۔

خطبہ استقبالیہ کا جواب جاری رکھتے ہوئے انہوں نے بپاکستان میں آباد اقلیتوں کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی: ''آپ جانتے ہیں کہ میری حکومت کی اور خود میری پالیسی یہ ہے کہ ذات، رنگ، عقیدے یا نسل کی تمیز روا رکھے بغیر ہر فرقے کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ کیا جائے اور یہ کہ پاکستان میں مکمل امن و امان ہر قیمت پر روا رکھا جائے۔''

اگلے روز انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے خطاب کیا اور اپنے پرزور لہجے میں فرمایا: ''میں یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت اسلئے پیش آئی کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ایک دو افسروں کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ

اس حلف کے منشاء سے کما حقہ آگاہ نہیں ہیں جو افواج پاکستان نے اٹھایا ہے، بلاشبہ حلف اٹھانا ایک رسم ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اہم جذبے اور دل کی سچائی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم رسم ہے اور میں اس توقع پر آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کیلئے حلف کی عبارت کو دہرانا چاہتا ہوں:۔ ''میں اللہ تعالیٰ کو حاضر وناظر جان کر صدقِ دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈومینین آف پاکستان کا وفادار رہوں گا۔ (آئین اور حکومت ڈومینین آف پاکستان کے الفاظ نوٹ کر لیجئے) اور یہ کہ میں مسلح افواج میں اپنی شرائط شمولیت کے مطابق فضا، خشکی یا سمندر میں انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دوں گا اور اپنے آفیسر کے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا۔۔۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ جذبہ ہی اصل چیز ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈومینین کے وفادار رہیں گے تو اس کیلئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ العمل موجودہ آئین کا مطالعہ کریں اور اسکے صحیح آئینی اور قانونی منشاء اور معانی کو سمجھیں۔''

15 جون 1948ء کو کوئٹہ میونسپلٹی کی جانب سے قائداعظم کے اعزاز میں استقبالیہ دیا گیا۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ انہیں پاکستان کے ہر طبقے میں صوبہ پرستی کی لعنت کو موجود دیکھ کر دکھ ہوتا ہے ۔ انہوں نے ہدایت کی کہ عوام خود کو بلوچی ، پٹھان، سندھی، پنجابی، بنگالی سمجھنے کے بجائے صرف اور صرف پاکستانی سمجھیں، اپنی تقریر کے آخر میں انہوں نے کہا: ''نمائندہ حکومت اور نمائندہ اداروں کا قیام بلاشبہ بہت اچھی اور پسندیدہ بات ہے لیکن جب لوگ خود کو صرف ذاتی مفادات تک محدود کرلیں تو یہ ادارے نہ صرف اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھتے ہیں بلکہ بدنامی کا باعث بھی بن جایا کرتے ہیں، ہمیں چاہئے کہ ہم یہ انداز اختیار کرنے سے گریز کریں اور ایسا صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جیسا میں پہلے کہہ چکا

ہوں کہ ہم اپنے اعمال کو ذاتی یا طبقہ دارانہ مفادات کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے مخصوص مفاد کے پیمانے سے جانچیں۔‘‘

قائداعظمؒ یکم جولائی 1948ء کو کراچی میں سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی دعوت قبول کر چکے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کوئٹہ سے کراچی تک کے سفر اور پھر ایک دوروز بعد کوئٹہ واپسی کے باعث ان کی صحت دوبارہ خراب نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے کوشش کی کہ انہیں یہ سفر نہ کرنے پر رضامند کرلوں، میں نے انہیں مشورہ بھی دیا کہ انہوں نے اس موقع کیلئے جو تقریر تیار کر رکھی ہے، وہ ان کی طرف سے کوئی اور پڑھ لے گا۔ اس پر انہوں نے جواب دیا: ’’تم جانتی ہو کہ کانگریس اور ہندو پیش گوئی کر چکے ہیں کہ پاکستان ایک دیوالیہ ملک ہو گا اور یہ کہ ہمارے لوگ تجارت، صنعت، بنکنگ، جہاز رانی اور انشورنس وغیرہ جیسے شعبوں کو نہیں چلا سکیں گے۔ چنانچہ ہمیں لازماً ثابت کرنا ہے کہ ہمارے پاس نہ صرف سیاسی شعبے میں ٹیلنٹ موجود ہے بلکہ مالیات اور بنکاری میں بھی ہمارے پاس باصلاحیت افراد کی کمی نہیں ہے، لہٰذا میری وہاں موجودگی نہایت ضروری ہے اور پھر اس کے بعد ہم چند روز کے اندر ہی کوئٹہ واپس آجائیں گے۔ تم میری صحت کے بارے میں اس قدر پریشان کیوں ہو، مجھے اپنا فرض بہرحال ادا کرنا ہے، میں اسے ملتوی نہیں کر سکتا اور تم کہہ سکتی ہو کہ میں اس سلسلہ میں کوئی خطرہ قبول نہیں کر سکتا۔‘‘

کراچی سے کوئٹہ کے ہوائی سفر کے باعث ان کی حالت خراب ہوگئی۔ چنانچہ سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کی صبح وہ اپنے بستر سے لگے پڑے تھے، وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے، اس کے باوجود اٹھے، تقریب کے لئے لباس زیب تن کر کے تیار ہوئے اور انہوں نے تقریب میں موجود معزز مہمانوں کے سامنے اپنا خطاب پڑھا۔ خرابی صحت کے باوجود ان کی

اس تقریب میں موجودگی ان کے خطاب کے پہلے ہی فقرے سے واضح ہوگئی:

''سٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح مالیاتی شعبے میں ہماری مملکت کی خودمختاری کی علامت ہے .... مسٹر گورنر جیسا کہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ غیر منقسم ہندوستان میں بنکاری زیادہ تر غیر مسلمانوں تک محدود تھی اور ان لوگوں کی مغربی پاکستان سے منتقلی سے ہماری نوزائیدہ مملکت کی معاشی زندگی میں بڑی حد تک خلل واقع ہوا ہے۔ صنعتی وتجارتی سرگرمیوں کو مناسب انداز میں جاری رکھنے کیلئے لازمی ہے کہ غیر مسلموں کے پاکستان سے چلے جانے کے باعث جو خلاء پیدا ہوگیا ہے، اسے فوری طور پر پُر کیا جائے، ضروریاتِ زندگی میں ہونے والے غیر معمولی اضافے نے مقررہ آمدنی والے لوگوں سمیت معاشرے کے غریب طبقوں کو بری طرح متاثر کیا ہے اور ملک میں پائی جانیوالی موجودہ بے چینی کا بھی بڑی حد تک یہی سبب ہے، حکومت پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو ایک ایسی سطح پر مستحکم کیا جائے جو اشیاء تیار کرنے والوں (صنعتکاروں اور تاجروں) اور صارفین دونوں کے لئے منصفانہ ہو۔۔۔مغرب میں اختیار کئے جانے والے معاشی نظام نے انسانیت کے لئے نہ ختم ہونے والے مسائل پیدا کئے ہیں اور ہم میں سے اکثر لوگ محسوس کرتے ہیں کہ صرف کوئی معجزہ ہی دنیا کو درپیش تباہی سے بچا سکتا ہے۔ یہ نظام انسانوں کے درمیان انصاف اور بین الاقوامی سطح پر کشیدگی ختم کرنے میں ناکام ہو چکا ہے، اس کے برعکس یہ گذشتہ نصف صدی میں بڑی حد تک دو عالمی جنگوں کا باعث بنا ہے، مغربی دنیا میکانکی ترقی اور بہتر صنعتی کارکردگی کے باوجود آج ایسی بدانتظامی اور انتشار کا شکار ہے جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ مغرب کے معاشی نظریات اور طریقکار کو اپنانے سے ہمیں ایک خوش وخرام اور مطمئن قوم کی تشکیل میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ہمیں اپنی قسمت کا فیصلہ خود اپنے طریقے کے مطابق کرنا ہوگا اور دنیا کے سامنے ایک ایسا معاشی نظام

پیش کرنا ہوگا جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے سچے اسلامی نظریہ پر مبنی ہو، صرف اسی صورت میں ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنا مشن پورا کر سکیں گے اور انسانیت کو امن کا پیغام دے سکیں گے اور محض اس کے ذریعے انسانیت کے لئے مسرت، فلاح و بہبود اور خوشحالی حاصل کی جا سکتی ہے۔''

تقریب میں موجود ہر شخص نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ قائداعظمؒ کی صحت خراب ہو چکی تھی، ان کی آواز بمشکل سنی جا رہی تھی۔ تقریر کے دوران رکتے رہے، کھانستے رہے، جب ہم تقریب سے فارغ ہو کر واپس گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو قائد کپڑوں اور جوتوں سمیت بستر میں لیٹ گئے، مگر ان کے ناتواں جسم میں نظر کو چندھیا دینے والی ذہانت کا شعلہ اب بھی اسی طرح روشن تھا۔

اسی شام امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر منعقد ہونے والے استقبالیہ میں شرکت کی دعوت بھی وہ پہلے ہی قبول کر چکے تھے۔ مگر خرابی صحت انہیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے نہیں روک سکتی تھی۔ انہوں نے تقریر کے لئے فوراً کپڑے بدل لئے اور ہم سفیر موصوف کی پارٹی میں جا پہنچے۔ انہوں نے تھکاوٹ یا کمزوری کو بالکل عیاں نہ ہونے دیا۔ استقبالیہ میں جن مہمانوں کا ان سے تعارف کرایا گیا، وہ ان کے ساتھ معمول کے مطابق باتیں کرتے رہے، بیماری ان کی خوش مزاجی کے نیچے کہیں دب کر رہ گئی۔ ایسے موقع پر اعلیٰ عہدہ اور پوزیشن جس قسم کی قیمت اور قربانی کا مطالبہ کیا کرتا ہے، وہ انہیں بہر حال ادا کرنا تھی، اور انہوں نے یہ قیمت مسکراتے ہوئے ادا کی۔

کراچی میں پانچ روز قیام کے دوران انہوں نے بعض انتہائی اہم فائلیں دیکھیں اور دیگر کام کیا۔ اسکے بعد ہم لوگ ہوائی جہاز سے کوئٹہ واپس لوٹ آئے۔ اگرچہ ہوائی سفر کے دوران

وہ ٹھیک رہے مگر اگلے ہی روز سے ان کی طبیعت میں پریشانی اور تھکاوٹ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ ہلکا بخار بدستور موجود تھا جس سے ان کی بے آرامی اور میری تشویش بڑھ گئی تھی۔ ایک بار پھر کوئٹہ میں مختلف اداروں کی طرف سے انہیں دعوت نامے موصول ہونے لگے اور بہت سے افراد اور لیڈروں کی طرف سے مطالبات ہونے لگے جو قائداعظمؒ کو دیکھنے کے لئے بے چین تھے۔ قائداعظمؒ کو افسوس تھا کہ خرابی صحت کے باعث وہ ان لوگوں کی خواہشات کا مزید احترام نہیں کر سکتے تھے۔ ایک روز انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم کوئٹہ سے زیارت چلے جائیں جو قریب ہی واقع ہے اور جہاں کا موسم کوئٹہ سے زیادہ ٹھنڈا اور یقیناً زیادہ آرام دہ ہوگا۔

زیارت کی ریذیڈینسی جہاں ہم ٹھہرے، وہ ایک پر منظر، پرانی اور دومنزلہ عمارت تھی، جو ایک بلند وبالا پہاڑی پر کسی مستعد چوکیدار کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے لان اور باغ وسیع ہیں، جہاں پرندے صبح نغمۂ حمد گاتے اور شام کو چہچہاتے، پھلدار درختوں کا ایک جھنڈ اور پھولوں کے تختے یہاں کے منظر کی خوبصورتی کو اور دوبالا کرتے۔ قائداعظمؒ اس کی خاموشی اور دلکشی پر فریفتہ ہوگئے۔

کمشنر کوئٹہ ڈویژن کی اہلیہ مسز خان نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر ریاض علی شاہ اپنے ایک مریض کو دیکھنے کے لئے زیارت آئے ہوئے ہیں اور ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر ریاض علیشاہ سے قائداعظمؒ کا معائنہ کرانا مفید رہے گا، جب میں نے یہ تجویز اپنے بھائی کے سامنے رکھی تو انہوں نے سختی سے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ انہیں کوئی زیادہ سنگین مرض لاحق نہیں ہے اور اگر صرف ان کا معدہ خوراک کو ذرا بہتر طور پر ہضم کرنے لگے تو وہ جلد ہی دوبارہ تندرست ہو جائیں گے، لیکن ڈاکٹروں کی ہدایات پر عمل کریں، یہ کھائیں، کس قدر کھائیں، کب سوئیں، کب تک سوئیں وغیرہ جیسی ہدایات سے ان کے گریز کی عمر بھر کی عادت بدستور قائم تھی۔

اب تک وہ اپنا تفصیلی معائنہ کرانے اور خود کو مکمل طور پر ڈاکٹروں کے رحم وکرم پر چھوڑنے سے انکار کرتے آئے تھے۔ انکا خیال تھا کہ وہ صحت کو اپنی مرضی کے تابع رکھ سکتے ہیں، مگر اب انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی یہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہونگی اور اس طرح پہلی بار ان کی صحت نے خود انہیں خطرے کا الارم دینا شروع کیا۔ ایک روز علی الصبح جب انہوں نے رضامندی ظاہر کی کہ اب انہیں اپنی صحت کے بارے میں مزید خطرات مول نہیں لینے چاہئیں، انہیں مناسب طبی مشورے اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے، مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر فرخ امین سے کہا کہ وہ کابینہ کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کریں اور ان سے کہیں کہ وہ لاہور کے نامور فزیشن جنرل ڈاکٹر کرنل الہٰی بخش کو فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز زیارت بھجوانے کا انتظام کریں۔ یہ 21 جولائی 1948ء کا واقعہ ہے۔

پیغام بھیجا جا چکا تھا اور ہم انتہائی بے تابی سے کرنل الہٰی بخش کی آمد کے منتظر تھے، قائداعظمؒ کی حالت مسلسل خراب ہوتی جا رہی تھی، لیکن جسمانی تکالیف کے باوجود ان کا ذہن بدستور چاق وچوبند اور بیدار تھا۔ ان کی روح اور جذبات نہ مرجھائے تھے اور نہ ان پر پژمردگی کے کوئی آثار تھے۔ انہوں نے زندگی میں بہت سی جنگیں جیتی تھیں اور انہوں نے خرابی صحت کے خلاف بھی اعتماد کے ساتھ جدوجہد کی تھی۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی جدوجہد کے راستے پر چلتے ہوئے گذاری تھی اور وہ اس کا اختتام اطمینان اور سکوت کی راکھ کے ڈھیر پر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر مجھ سے نئے آئین، کشمیر اور مہاجرین کے بارے میں باتیں کرتے رہتے تھے۔ میں ان کے الفاظ پوشیدہ میں ان کی روح کے کرب کو محسوس کر سکتی تھی کہ ان کی حالت اب ایک ایسے شخص کی سی ہو رہی تھی جو بہت سے کام کرنا چاہتا ہو مگر اس کے

پاس انہیں سرانجام دینے کیلئے بہت تھوڑا وقت اور بہت معمولی توانائی رہ گئی ہو۔اسکے باوجود اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ شمع کو اپنی روشنی پھیلاتے رہنا چاہئے، یہاں تک کہ صبح کا اجالا خود اس کا فرض سنبھال لے۔

23 جولائی 1948ء بروز جمعہ شام ڈھلے مجھے فرخ امین کی زبانی جان کر اطمینان ہوا کہ کرنل الٰہی بخش پہنچ چکے ہیں اور قائداعظمؒ کے معائنے کے لئے نچلی منزل پر منتظر ہیں۔میں نے یہ خوشخبری اپنے بھائی کو سنائی تو انہوں نے جوش سے خالی لہجے میں کہا: ''ڈاکٹر سے کہو کہ وہ کل صبح معائنے کیلئے آئیں، اب شام زیادہ ہو چکی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے ڈسٹرب کرے۔'' ڈاکٹر کی آمد کی خبر کو انہوں نے جس انداز میں لیا تھا، اس پر مجھے حیرت ہوئی اور میں نے محبت بھرے انداز کا سہارا لے کر ان سے التجا کی کہ وہ ڈاکٹر کو اپنا معائنہ کرنے کی اجازت دے دیں کیونکہ اپنی زندگی سے کھیلنا دانش مندی کی بات نہیں۔اس کے جواب میں ان کے چہرے پر ایسی دلکش مسکراہٹ پھیل گئی کہ مجھے مکمل طور پر پسپا ہوتے ہوئے ان کی بات ماننا پڑی۔

اگلی صبح میں کرنل الٰہی بخش کو قائداعظمؒ کے پاس لے گئی اور اس سے پہلے کہ ڈاکٹر مریض سے کوئی سوال کرتا، انہوں نے کہا: ''ڈاکٹر! مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار گذرا ہوگا۔''

اس کے بعد ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائدؒ سے ان کی بیماری سے متعلق اور اس کی سابقہ علامات وغیرہ سے متعلق دریافت کیا۔قائداعظمؒ نے 1934ء سے لے کر اب تک اپنی بیماری کی مختصر تفصیل ٹھیک ٹھیک ڈاکٹر کو بتادی اور اس گفتگو کے دوران ان کا تمام تر زور اس بات پر رہا کہ وہ بھلے چنگے ہیں اور یہ کہ وہ جلد ہی معمول کے مطابق دوبارہ کام کرنے لگیں گے اور پروگرام کے مطابق اپنی دوسری مصروفیات پر بھی عمل پیرا ہو جائیں گے، بشرطیکہ ان کا معدہ ٹھیک ہو جائے۔

انہوں نے مزید کہا:

''میں گذشتہ چودہ برس سے روزانہ چودہ گھنٹے کام کر رہا ہوں، صحیح معنوں میں مجھے کبھی علم ہی نہیں ہوسکا کہ بیماری کیا چیز ہوتی ہے، تاہم گذشتہ چند برس سے مجھے اکثر کھانسی اور بخار کی شکایت رہنے لگی ہے مگر چند روز کے آرام سے میں ان دونوں پر قابو پالیتا ہوں۔ حال ہی میں ان کی شدت اور تواتر زیادہ ہونے لگا ہے، اور انہوں نے مجھے نڈھال کر دیا ہے۔''

یہ چند جملے ادا کرنے کے دوران قائداعظمؒ تھک چکے تھے۔ ڈاکٹر نے ان کی نبض دیکھنے کے لئے ان کا بایاں بازو تھام لیا۔ مریض بار بار کھانس رہا تھا، انہوں نے دوبارہ کہنا شروع کیا: ''چند ہفتے قبل مجھ پر سردی اور زکام کا حملہ ہوا اور میں پنسلین لوزنجس (Pencilin Lozenges) استعمال کرتا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ بنیادی طور پر مجھے کوئی مرض لاحق نہیں ہے۔ میرا معدہ ہی تمام تر مشکلات اور بیماریوں کا باعث بنا ہوا ہے۔ تقریباً پندرہ برس پہلے لندن میں بعض ڈاکٹروں نے مجھے معدے کا آپریشن کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر جب میں نے جرمنی میں بعض ڈاکٹروں سے مشورہ لیا تو انہوں نے کہا کہ آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے۔ انہی دنوں بمبئی میں میرے ڈاکٹر نے تشخیص کی کہ مجھے دل کی بیماری ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں کہ خود ڈاکٹروں کی رائے بھی ایک نہیں ہے۔''

جب کرنل الٰہی بخش ان کا تفصیلی معائنہ کر چکے تو انہوں نے کہا:

''سر! آپ کا معدہ بالکل ٹھیک ہے مگر میں آپ کا سینے اور پھیپھڑوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں آپ کے خون اور تھوک کا معائنہ کروں گا اور اس کام کیلئے مجھے ضروری آلات ، ساز و سامان اور چند معاون ڈاکٹروں کی ضرورت ہوگی۔''

قائداعظمؒ خاموشی سے ڈاکٹر کی باتیں سنتے رہے۔ اس نے کہا کہ ''سر آپ کو لازمی طور پر

کافی مقدار میں مقوی خوراک استعمال کرنی چاہئے۔''

آپ ناشتے میں دلیہ، انڈے، مکھن، ڈبل روٹی، کافی اور دودھ کی کافی مقدار استعمال کریں۔ دوپہر کے کھانے میں مرغی کا قیمہ، سبزیاں اور کسٹرڈ یا جیلی کھائیں اور رات کے کھانے میں بھنی ہوئی مچھلی اپنی پسندیدہ چٹنی کے ساتھ استعمال کریں۔ اس کے علاوہ سبزیاں، پھل، پڈنگ اور کافی بھی استعمال کریں۔

''یہ تو بہت زیادہ ہے ڈاکٹر۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا میرا کمزور معدہ اس قدر خوراک برداشت کر سکے گا؟''

''سر! آپ کو زیادہ کیلوریز والی خوراک کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے مریض کے لئے یہ ازحد ضروری ہے۔''

اگلی صبح کوئٹہ کے سول سرجن ڈاکٹر صدیق اور کلینیکل پتھالوجسٹ ڈاکٹر محمود ضروری ساز و سامان اور آلات کے ساتھ ریذیڈینسی پہنچ گئے۔ انہوں نے قائداعظمؒ کے خون اور تھوک کے نمونے لئے اور اسی روز بعد دوپہر مجھے یہ منحوس خبر ملی کہ نتیجہ قطعی تھا۔ مجھے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ میں کیا کر سکتی تھی؟ میں نے مناسب سمجھا کہ کرنل کو چاہئے کہ وہ قائداعظم کو ان کے مرض کے متعلق بتا دیں کیونکہ میرے خیال میں خوراک، آرام اور علاج ہر معاملے میں ان کا مکمل تعاون حاصل کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب کرنل الٰہی بخش قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے غیر ضروری تشویش سے خالی لہجے میں کہا: ''سر! مجھے اندیشہ ہے کہ کلینکل ٹسٹوں کے نتائج کے مطابق آپ کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہو گیا ہے۔''

قائداعظمؒ نے یہ خبر خاموشی سے سنی اور چند منٹ کے بعد انہوں نے کہا: ''اس کا مطلب یہ

ہوا کہ مجھے ٹی بی ہے۔"

کرنل الٰہی بخش ان کی بات سن کر خاموش رہا: "ڈاکٹر ذرا بتایئے کہ مجھے یہ شکایت کتنے عرصے سے ہوسکتی ہے؟" قائداعظمؒ نے استفسار کیا۔

"سر! میرا خیال ہے یہ مرض کم از کم دو برس پرانا تو ضرور ہے، مگر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے میں آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں، مرض زیادہ سنگین نہیں ہے۔ ہم اپنی پوری کوشش کرینگے اور اگر آپ کا جسمانی نظام علاج سے ہم آہنگ ہوگیا تو آپ جلد ہی بالکل تندرست و توانا ہوجائیں گے۔"

"کیا مس جناح اس کے بارے میں جانتی ہیں؟ کیا آپ نے انہیں میرے مرض سے آگاہ کردیا ہے؟"

"یس سر، میں نے انہیں بتادیا ہے۔"

میرا خیال ہے، آپ نے ایسا کر کے غلطی کی ہے کیونکہ وہ ایک خاتون ہیں۔" عین اسی لمحے میں کمرے میں داخل ہوئی اور قائداعظمؒ نے ڈاکٹر سے پوچھا: "آپ کے خیال میں مجھے کب تک بستر میں رہنا پڑے گا؟ آپ جانتے ہیں کہ میری بہت سی ذمہ داریاں ہیں اور مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"سر، اس سوال کا کوئی فوری جواب دینا قبل از وقت ہوگا مگر آپ کو جلد از جلد صحتیاب کرنے کیلئے ہر ممکن تدبیر کی جائے گی۔"

اپنے بھائی کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب، بے پناہ تھکن اور پژمردگی کی غمازی کرتا تھا، ان کی دلجوئی کرنے کیلئے میں تنہا تھی۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائے اور کہا: "فاطی! تم نے دیکھا، تم درست ہی کہا کرتی تھیں...... مجھے سپیشلسٹ سے پہلے مشورہ

کرنا چاہئے تھا.... مگر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، آدمی صرف جدوجہد کرسکتا ہے..... تقدیر کی زبان ہمیشہ گونگی ہوا کرتی ہے..... میں اپنے فرائض اس وقت تک انجام دیتا رہوں گا، جب تک میں انہیں ادا کرنے کے قابل ہوں... تم جانتی ہو میرا ہمیشہ سے اصول رہا ہے... کہ میں کبھی آنکھیں بند کر کے... دوسروں کے مشورے قبول نہیں کیا کرتا... میں نے ہمیشہ اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق عمل کیا ہے... اور میں نے زندگی کی شدید مشکلات سے سیکھا ہے۔''

چند ماہ قبل انہوں نے اسلامیہ کالج پشاور کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا: ''آپ زندگی کے دوران درپیش مشکلات اور قیمتی تجربے سے بہت کچھ سیکھیں گے۔''

اپنے مخصوص طریقہ کار اور مشکلات سے سیکھنے کا انداز زندگی بھر ان کے کردار کی نمایاں خصوصیت رہا تھا۔

یہ بات کافی حوصلہ افزاء تھی کہ گذشتہ کئی ہفتوں کے مقابلے میں اب وہ زیادہ مقدار میں کھانا کھانے لگے تھے۔ غذا بڑھانے کی غرض سے میں نے امانت علی کو باورچی کے طور پر رکھ لیا جس نے کھانا پکانے کا فن پیرس کے رٹز ہوٹل میں سیکھا تھا۔ وہ کچھ عرصے تک مہاراجہ کپورتھلہ کا باورچی بھی رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے قائداعظمؒ کا ٹمپریچر وغیرہ نوٹ کرنے کیلئے ایک خاتون کمپاؤنڈر کو بھی اپنے عملے میں شامل کرلیا۔ پہلی بار قائداعظمؒ نے اس خاتون سے پوچھا: ''میرا ٹمپریچر کتنا ہے؟'' اس پر اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''سر! یہ میں صرف ڈاکٹر کو بتا سکتی ہوں۔'' قائداعظمؒ نے اصرار کیا: ''مگر میں اپنا ٹمپریچر معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' خاتون کمپاؤنڈر اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ''سوری سر! میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔''

جونہی لیڈی کمپاؤنڈر کمرے سے باہر گئی تو قائداعظمؒ مسکرائے اور انہوں نے مجھ سے

کہا: ''میں اس قسم کے لوگوں کو پسند کرتا ہوں ،ایسے لوگ جو مصمم ارادہ کے مالک ہوں۔۔۔اور جو خوفزدہ ہونے سے صاف انکار کردیں۔''

ان دنوں کسی کو قائداعظمؒ سے ملنے کی اجازت نہیں تھی ،مگر جب واشنگٹن میں متعین پاکستانی سفیر مسٹر حسن اصفہانی زیارت میں ہمارے گھر آئے تو قائداعظمؒ مسٹر اصفہانی سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ وہ قائداعظمؒ کے قریبی ساتھیوں میں شامل تھے۔اپنے لیڈر کو دیکھ کر جب مسٹر اصفہانی نیچے اترے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ اس ماہر سیاستدان کو جس نے بہت سی سیاسی لڑائیاں لڑی تھیں، بے بسی سے بستر میں پڑے ناتوانی کے ساتھ اپنی زندگی کی جنگ لڑتے دیکھ کر خود پر قابو نہیں رکھ سکے تھے۔انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو بتایا کہ انہیں قائداعظمؒ کیلئے امریکہ سے ضروری سپیشلسٹ ڈاکٹر اور مطلوبہ ادویات بھجوا کر بے حد خوشی ہوگی۔ڈاکٹر الٰہی بخش نے جواب دیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ بخوشی مسٹر اصفہانی سے ایسا کرنے کے لئے کہیں گے۔

اس اثناء میں ڈاکٹر الٰہی بخش کی درخواست پر لاہور سے ڈاکٹر ریاض علیشاہ،ڈاکٹر عالم ایکسرے سپیشلسٹ اور کلینکل پتھالوجسٹ ڈاکٹر غلام محمد ایکسرے اور دوسرے ضروری آلات اور سازوسامان کے ساتھ زیارت پہنچ گئے۔ان کے معائنے اور ٹسٹوں کے نتیجے میں ڈاکٹر الٰہی بخش کی رائے اور تشخیص کی تصدیق ہوگئی۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ قائدؒ کے پاس رات کے وقت کسی نرس کو موجود رہنا چاہئے۔ پہلے تو قائدؒ نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ان کی مناسب دیکھ بھال ہورہی ہے اور یہ کہ نائٹ ڈیوٹی کیلئے علیحدہ سے نرس رکھنا پیسے کا ضیاع ہوگا۔مگر بالآخر وہ راضی ہوگئے اور انہوں نے کہا: ''گذشتہ کئی ہفتوں سے...... میری بہن دن رات میری دیکھ بھال کررہی ہے......وہ یقیناً تھک گئی ہوگی... ہاں آپ رات کے لئے کوئی نرس رکھ لیجئے۔اس

طرح سول ہسپتال کوئٹہ میں کام کرنے والی نرس سسٹر فلس ڈنہام زیارت آ گئی۔ وہ انتہائی مستعد نرس ثابت ہوئی اور اس خوبی کے باعث قائداعظمؒ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ سسٹر ڈنہام نے ڈاکٹر الٰہی بخش کو بتایا کہ قائداعظمؒ سلکی پاجامہ پہنتے ہیں، جو انکی زندگی بھر کی عادت تھی اور اس کے باعث وہ اکثر رات کو سردی سے کانپتے رہتے ہیں۔ اس پر ڈاکٹر نے کراچی سے ایک ڈائیلیلا (Viyella) منگوایا اور میں نے قائد کیلئے چند پاجامے بنوا دیئے۔ اب وہ پہلے سے زیادہ پرسکون نظر آنے لگے تھے۔ کئی کئی گھنٹے سوئے رہتے اور خوراک بھی اب وہ کافی مقدار میں کھانے لگے تھے۔ اس سے ہمارے لئے امید کی کرن پیدا ہو گئی۔ انکا ٹمپریچر اب نارمل رہنے لگا تھا۔ ان کی کھانسی پر کافی حد تک قابو پا لیا گیا تھا اور بلڈ پریشر بھی اب تشویشناک نہیں تھا۔

جولائی کے اواخر میں وزیراعظم لیاقت علی خان کسی پیشگی اطلاع کے بغیر چودھری محمد علی کے ہمراہ زیارت آ گئے۔ انہوں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے قائداعظمؒ کی صحت کیبارے میں دریافت کیا۔ ڈاکٹر نے کہا: چونکہ وہ میرے بلانے پر قائداعظمؒ کے معائنے اور علاج کے لئے یہاں آئے ہیں، اس لئے وہ انہیں (لیاقت علیخان کو) اپنے مریض کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔

"مگر بحثیت وزیراعظم میں انکی صحت کے بارے میں جاننے کیلئے بے تاب ہوں۔"

ڈاکٹر نے شائستگی سے جواب دیا "یس سر، مگر میں مریض کی اجازت کے بغیر ایسا نہیں کر سکتا۔"

جب مجھے بتایا گیا کہ وزیراعظم اور سیکرٹری جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں، میں فوراً قائداعظمؒ کے پاس پہنچی اور ان لوگوں کی آمد کی اطلاع دی...... چند منٹ بعد قائداعظمؒ نے فرمایا "نیچے جایئے۔۔۔ وزیراعظم کو بتایئے کہ۔۔۔ میں ان سے ملاقات کرونگا۔"

''اسوقت دیر ہو چکی ہے، آپ ان لوگوں سے کل صبح ملاقات کر لیجئے۔''

''نہیں نہیں، اسی وقت آنے دیجئے۔''

قائداعظمؒ اور لیاقت علیخان کے درمیان ملاقات تقریباً نصف گھنٹے تک جاری رہی۔ جونہی لیاقت علیخان نچلی منزل پر آئے، میں اوپر اپنے بھائی کے پاس چلی گئی۔ وہ بری طرح تھک چکے تھے اور انکی آنکھوں سے بھی بیماری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے فروٹ جوس لانے کو کہا اور پھر بولے: ''مسٹر محمد علی کو بھجوا دیجئے۔۔۔'' کابینہ کے سیکرٹری جنرل تقریباً پندرہ منٹ قائداعظمؒ کے ساتھ رہے۔ جب قائدؒ ایک بار پھر تنہا ہوئے تو میں ان کے کمرے میں چلی گئی اور ان سے پوچھا کہ وہ جوس پینا پسند کرینگے یا کافی۔ مگر انکا ذہن میری بات کا جواب دینے کی بجائے شاید کسی اور ہی بات میں الجھا ہوا تھا۔ رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ انہوں نے کہا: ''بہتر ہوگا۔۔۔ آپ نیچے جائیں۔۔۔ اور ان لوگوں کے ساتھ۔۔۔ کھانا کھائیں۔''

نہیں...... یہ درست نہیں........ وہ یہاں ہمارے..... مہمان ہیں.... جائیے... جا کر انکے ساتھ کھانا کھائیے۔''

14 اگست قریب آ رہا تھا۔ جب ہماری قوم کو آزادی کی پہلی سالگرہ منانا تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے کے برعکس قائدؒ اس موقع پر قوم کے نام پیغام کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ خرابیِ صحت کے باوجود اس پیغام کی تیاری کے لئے کام کر رہے تھے۔ یومِ آزادی کے روز جاری کئے جانے والے پیغام میں کہا گیا تھا:

''یاد رکھئے پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی... مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے....... اس نوزائیدہ مملکت کا پیدائش کے وقت ہی گلا گھونٹ دینے کی کوشش میں ناکامی کے بعد ہمارے دشمنوں کو اب بھی امید ہے کہ وہ اقتصادی

ہتھکنڈوں کے ذریعے اپناوہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو انکے دل میں ہے تعصب اور بددیانتی جس قدر دلائل مہیا کر سکتے ہیں، اوران کے ذریعے جتنے بھی بہانے بنائے جاسکتے ہیں، ان تمام کو بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے (ہندوؤں نے) پیشگوئی کی تھی کہ پاکستان دیوالیہ ہوکر رہ جائیگا۔ دشمن کی گولی اور تلوار جو مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی، وہ مملکت کی تباہ شدہ مالی اور اقتصادی حالت کے باعث پورا ہوسکتا ہے۔ مگر برائی کے پیغمبروں کے تمامتر دعوے باطل ثابت ہو چکے ہیں..... ہمارااولین بجٹ ہی ایک فاضل بجٹ ہے۔ تجارت کا توازن بھی ہمارے حق میں رہا ہے اور اقتصادی شعبے میں بحیثیت مجموعی ترقی ہورہی ہے۔''

چندروز بعد ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ قائداعظمؒ کا بلڈ پریشر بہت کم ہو گیا ہے۔ ان کے پاؤں پر ورم آگیا ہے اوران کے پیشاب کی مقدار بڑی حد تک کم ہوگئی ہے۔ باہم طویل صلاح مشورے کے بعد ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ قائداعظمؒ گردوں کی کمزوری میں مبتلا ہیں۔ ان کی صحت کے باعث زیارت میں ان کا قیام موزوں نہیں ہے، قائداعظمؒ نے اس مشورے سے اتفاق کیا مگرانہوں نے اصرار کیا کہ انہیں 14 اگست کے بعد ہی کوئٹہ منتقل کیا جائے کیونکہ اس روز ہماری آزادی کی پہلی سالگرہ منائی جارہی ہے۔ ڈاکٹر اس وقت تک انتظار کرنے کیلئے تیار نہ تھے اوراس طرح بالآخر ہم لوگ 13 اگست کو زیارت سے کوئٹہ روانگی کے لئے تیار ہوگئے۔

قائداعظمؒ نے اصرار کیا کہ وہ پاجامہ سوٹ میں سفر نہیں کرینگے کیونکہ ان کے بقول انہوں نے اپنی پوری زندگی کیدوران کبھی ایسانہیں کیا تھا۔ میں خوش تھی کہ وہ مسلسل زندگی سے دلچسپی کا اظہار کررہتے تھے۔ چنانچہ میں ان کے لئے ایک بالکل نیا سوٹ نکال لائی جوانہوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں پہنا تھا۔ اس کے ساتھ میچ کرتی ہوئی ٹائی بھی نکالی اور رومال سوٹ کی

آرائشی جیب میں سجادیا۔ چمکدار پمپ شوز انہیں پہنائے، انہیں ایک سٹریچر پر لٹا کر ریذیڈنسی کی دوسری منزل سے نیچے لایا گیا اور تکیہ لگا کر نیم دراز پوزیشن میں ایک بڑی بمبر کار کی پچھلی نشست پر بٹھادیا گیا۔ اس کار میں ہم نے زیارت سے کوئٹہ کا سفر کیا۔ میں ان کے بالکل برابر بیٹھ گئی اور سسٹر ڈنہام کو اضافی کرسی پر بٹھادیا گیا۔ ان کا اے ڈی سی اگلی سیٹ پر شوفر کے برابر بیٹھ گیا۔

جھٹکوں اور ہچکولوں سے بچنے کے لئے کار سست رفتار سے سفر کرتی رہی۔ راستے میں ہم دو بار رکے اور میں نے انہیں چائے اور بسکٹ وغیرہ دیئے۔ ہمیں کوئٹہ پہنچنے میں چار گھنٹے لگے اور مجھے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا رہا کہ آیا وہ اس سفر کی صعوبت کو برداشت بھی کر پائیں گے یا نہیں۔ کوئٹہ ریذیڈنسی پہنچتے ہی جہاں ہمیں قیام کرنا تھا، ڈاکٹروں نے انکا معائنہ کیا۔ ڈاکٹروں نے مجھے یقین دلایا کہ قائداعظمؒ بخیریت طے ہوا ہے۔ قائدؒ نے چند گھنٹوں کے بعد ڈاکٹروں سے کہا: ''میں یہاں زیادہ بہتر محسوس کر رہا ہوں..... زیارت میں..... مجھے سانس لینے میں دشواری محسوس ہوتی تھی۔''

ان کی صحت اب بہتر ہونے لگی تھی، اس پر ڈاکٹر الٰہی بخش نے مشورہ دیا کہ وہ روزانہ تقریباً ایک گھنٹہ فائلوں وغیرہ کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہر وقت صحت کے متعلق سوچتے رہنے کے بجائے زیادہ بہتر یہ ہوگا کہ قائداعظمؒ کے مستعد ذہن کو کام کی جانب مبذول کردیا جائے۔ قائدؒ بہت خوش تھے اور انہوں نے اس آزادی کا بڑے مزے سے لطف اٹھایا، چند روز کے بعد ڈاکٹروں نے ان سے کہا کہ وہ بستر سے نکل کر ان کی مدد سے اپنے کمرے کے اندر ہی چند قدم چل لیا کریں، تاکہ اس عمل سے ان کے خون کی گردش میں آسانی پیدا ہوسکے۔ انہوں نے ڈاکٹروں کا یہ مشورہ خوشی سے قبول کرلیا۔ وہ ایک بار پھر خوش تھے کہ کئی

ہفتوں کے بعد وہ بیماری سے اٹھ کھڑے ہونے کے قابل ہو چکے تھے۔ یہ بات خاصی حوصلہ افزاء تھی کہ ان میں ابھی تک جدوجہد جاری رکھنے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ جب انہوں نے ڈاکٹروں کو مندرجہ ذیل کہانی سنائی تو اس سے ان کی صحت کیبارے میں پیدا ہونے والی امید یقین میں بدلتی نظر آنے لگی۔

ڈاکٹر میں آپ کو ایک کہانی سناؤں گا۔ ایک عورت نے اپنے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ چل نہیں سکتی کیونکہ وہ کئی ماہ تک بیمار رہی ہے اور بستر سے نہیں نکلی۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ صحتیاب ہو چکی ہے، اسلئے ضروری ہے کہ وہ بستر سے نکل آئے اور چلنا شروع کر دے۔ ڈاکٹر کے تمامتر دلائل کے باوجود عورت نے انکار کر دیا۔ تب ایک دوسرا ڈاکٹر آیا۔ اس نے عورت کا معائنہ کیا اور اس نے بھی وہی مشورہ دیا۔ یہاں پہنچ کر قائداعظمؒ بے دم ہو کر سانس لینے کے لئے رکے۔ اس کے بعد ایک اور ڈاکٹر آیا۔ اس نے عورت کو بتائے بغیر ایک جلتا ہوا اسٹوو اس کے بستر کے نیچے رکھ دیا۔ عورت نے محسوس کیا کہ اس کا بستر جلد ہی شعلوں کی لپیٹ میں آ جائے گا.... اس پر وہ عورت جلدی سے بستر سے چیختی ہوئی باہر نکل آئی . . . ہم سب یہ کہانی سن کر ہنس دیئے۔ ''ڈاکٹر، کیا آپ بھی میرے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں؟''

پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد انہوں نے کہا: ''ڈاکٹر، میں سگریٹ پینا چاہتا ہوں، میں نے کئی روز سے سگریٹ نوشی نہیں کی... کیا میں سگریٹ پی سکتا ہوں؟''

ڈاکٹر الٰہی بخش نے پر یقین لہجے میں کہا: ''یس سر، صرف ایک سگریٹ روزانہ سے شروع کیجئے، مگر اسکا دھواں نہیں نگلئے گا۔''

میں ان کے پسندیدہ برانڈ کے سگریٹ کریون اے کا کارٹن نکال لائی۔ وہ سدا سے بلا کر سگریٹ نوش رہے تھے اور دن بھر میں تقریباً پچاس سگریٹ پی جاتے تھے۔

شام کو ڈاکٹر پھر آیا۔ اس نے ایش ٹرے میں سگریٹ کے پانچ جلے ہوئے ٹکڑے پڑے دیکھے تو دریافت کرتے ہوئے اپنے مریض کی جانب دیکھا، قائداعظمؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''ہاں، ڈاکٹر! میں نے پانچ سگریٹ پی لئے ہیں، مگر میں نے انکا دھواں نہں نکلا۔'' اس کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنسے، ایک بچے کی طرح خوش۔

اس سال عید الفطر 27 اگست کو آرہی تھی اور وہ عید کی مناسبت سے قوم کے نام اپنا پیغام تیار کرنے میں مصروف تھے۔ یہ پیغام ان کی سینکڑوں تقاریر کا اختتام ثابت ہوا جو انہوں نے اپنطویل سیاسی کیریئر کے دوران تیار کی تھیں۔ انہوں نے اپنے پیغام میں لکھا:

''صرف مشترکہ کوششوں اور مقدر پر یقین کے ساتھ ہی ہم اپنے خوابوں کے پاکستان کو حقیقت کا روپ دے سکتے ہیں....''

گذشتہ عید الفطر جو قیامِ پاکستان کے فوراً بعد آئی تھی، مشرقی پنجاب کے المناک واقعات کے باعث ہمارے لئے اپنے ساتھ لانے والی خوشیاں کھو چکی تھی۔ گذشتہ سال کے خونی واقعات اور ان کے نتیجہ میں..... لاکھوں لوگ اپنے گھروں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ان واقعات نے عدیم المثال قسم کی مصیبت کھڑی کر دی۔ بے گھر انسانوں کو نئے سرے سے آباد کرنے میں ہماری تمام تر توانائیاں صرف ہو گئیں تھیں، اور ہمارے وسائل اختتام کی آخری حدوں کو چھونے لگے۔ اس کام کی شدت اور وسعت نے ہم سب کو بری طرح متاثر کیا تھا اور مشکلات کے اس سیلاب میں صرف ہمارے سر ہی پانی سے باہر رہ گئے تھے۔ بارہ ماہ کا مختصر عرصہ تمام مہاجرین کو جو پاکستان میں آچکے تھے، منافع بخش روزگار مہیا کرنے کیلئے کافی نہیں تھا۔ ان کی دوبارہ بحالی کیلئے خاطر خواہ کام کیا جا چکا ہے، مگر انکی کافی تعداد کو بحال کرنے کا کام ابھی باقی ہے۔ ہم اسوقت تک خوشی نہیں منا سکتے، جب تک ان میں سے ہر ایک دوبارہ

اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ اگلی عید تک یہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ حل کر لیا جائیگا اور تمام مہاجرین کو پاکستانی معیشت میں مفید شہریوں کی حیثیت سے جذب کر لیا جائیگا۔"

اپنا پیغام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا؛

"برادر مسلم ممالک کیلئے میرا پیغامِ عید دوستی اور خیر سگالی پر مبنی ہے، ہم سب ایک خطرناک دور سے گذر رہے ہیں۔ طاقت کی سیاست کا ڈرامہ جو فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر میں کھیلا جا رہا ہے، اس سے ہماری آنکھیں کھل جانی چاہئیں۔ صرف ایک متحدہ محاذ کے قیام کے ذریعے ہی ہماری آواز دنیا کے ایوانوں میں سنی جا سکتی ہے۔ چنانچہ میں آپ سے اپیل کرنا چاہتا ہوں کہ آپ اسے خواہ کوئی بھی زبان دیں، مگر میرے مشورے کی روح یہ ہے کہ: "ہر مسلمان کو دیانت داری، خلوص اور بے غرضی سے پاکستان کی خدمت کرنی چاہیے۔"

یہ قائداعظمؒ کے آخری ریکارڈ شدہ الفاظ ثابت ہوئے:

"اگست کے آخری دنوں میں قائداعظمؒ اچانک ہر چیز سے بے نیاز نظر آنے لگے اور ایک روز انہوں نے انہماک سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا: "فاطی، مجھے اب مزید زندہ رہنے سے.... کوئی دلچسپی نہیں،.... میں جتنی جلدی چلا جاؤں..... اتنا ہی بہتر ہو گا۔"

یہ بدشگونی کے الفاظ تھے۔ میں کانپ گئی، جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو، مگر میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا: "جن! آپ جلد ہی اچھے ہو جائینگے، ڈاکٹر پرامید ہیں۔"

وہ مسکرائے، ایک مردے کی سی مسکراہٹ: "نہیں۔۔۔ میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

یکم ستمبر کو ڈاکٹر الٰہی بخش نے مجھ سے مایوس لہجے میں کہا: "قائداعظمؒ پر ہیمرج کا حملہ ہوا

ہے، میں پریشان ہوں، ہمیں انہیں کراچی لے جانا چاہئے، کوئٹہ جیسے شہر کی بلندی ان کے لئے موزوں نہیں ہے۔" ان کی حالت خراب ہونا شروع ہوگئی اور 5 ستمبر کو ان کے تھوک کے معائنے سے ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ ان پر نمونیے کے حملے کے آثار نمایاں ہیں۔ خون کے معائنے سے یہ بھی پتہ چلا کہ انہیں شدید انفیکشن ہو چکا ہے۔ انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس پر ڈاکٹروں نے انہیں آکسیجن دینا شروع کر دی۔ 7 ستمبر کو میں نے واشنگٹن میں مسٹر اصفہانی کے نام تار دیا کہ وہ فوراً امریکہ سے اس سپیشلسٹ کو بھجوائیں جس کا نام ڈاکٹر ریاض نے تجویز کیا تھا۔ اس سے اگلے روز میں نے کراچی کے ڈاکٹر محمد علی مستری کو فون کیا کہ وہ کوئٹہ پہنچے۔ ڈاکٹروں نے ایک بار پھر اس بارے میں صلاح مشورہ کیا اور صورتحال کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں فوراً کراچی لے جانا ضروری ہے کیونکہ ان کے کمزور دل کے لئے کوئٹہ کی بلندی مناسب نہیں ہے۔ انہوں نے بادل نخواستہ مجھے آگاہ کیا کہ اب امید کی کوئی کرن باقی نہیں ہے اور صرف کوئی معجزہ ہی قائداعظمؒ کی زندگی بچا سکتا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو ان کے ڈاکٹروں کے اس مشورے کے متعلق بتایا کہ کوئٹہ کی بلدنی سے بچنے کے لئے انہیں کراچی لے جایا جائے تو انہوں نے کہا: "ہاں..... مجھے کراچی لے چلئے... میں وہیں پیدا ہوا تھا..... میں وہیں.... دفن ہونا چاہتا ہوں۔" ان کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ میں انکے بستر کے پاس کھڑی رہی، ان کی بیہوشی میں، میں انکے خیالات کی بڑبڑاہٹ سن سکتی تھی۔ وہ نیند میں سرگوشی کر رہے تھے: "کشمیر..... انہیں..... فیصلہ کرنے کا.... حق دیجئے..... آئین..... میں اسے جلد ہی . . . . مکمل کروں گا . . . . . . مہاجرین . . . انہیں ہر ممکن . . . . . امداد دیجئے.... پاکستان........"

گورنر جنرل کے طیارے وائی کنگ کو فی الفور کوئٹہ لانے کا حکم دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے گیارہ ستمبر کو فیصلہ کیا کہ ہمیں دو بجے دوپہر کراچی روانگی کیلئے کوئٹہ کے ہوائی اڈے پر پہنچ جانا چاہئے، جب قائدؒ کو ایک سٹریچر پر لٹا کر وائی کنگ کے کیبن میں لے جایا جا رہا تھا تو پائلٹ اور طیارے کے عملے کے دوسرے ارکان انہیں سلیوٹ کرنے کیلئے قطار میں کھڑے تھے۔ انہوں نے بمشکل اپنا کمزور ہاتھ اٹھا کر ان لوگوں کے سلیوٹ کا جواب دیا۔

ہم نے انہیں ان سیٹوں پر آرام سے لٹا دیا، جنہیں ایک عارضی بستر کی شکل میں کیبن کے سامنے رکھوا دیا گیا تھا، ڈاکٹر مستری، سسٹر ڈنہام اور میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے خبردار کیا کہ اسے کچھ وقت کیلئے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنا پڑے گی مگر جونہی وہ بلوچستان کے پہاڑوں سے آگے نکل جائیگا تو طیارہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکے گا۔ آکسیجن سلنڈر اور گیس ماسک تیار رکھے گئے اور زیادہ بلندی پر قائدؒ کو آکسیجن دینے کا فرض میرے ذمے تھا۔ ہم فضاء میں بلند ہو چکے تھے۔ وائی کنگ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ قائدؒ کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ میں نے گیس ماسک ان کے منہ سے لگا دیا، وہ کچھ دیر تک آکسیجن لیتے رہے اور پھر ماسک منہ پر سے ہٹا دیا جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں: "اس کی ضرورت نہیں، سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔" میں نے ڈاکٹر مستری سے ڈاکٹر الٰہی بخش کو بلانے کے لئے کہا اور یہ دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی کہ ڈاکٹر الٰہی بخش انہیں آکسیجن لینے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں اس سے زیادہ تشویشناک ہوائی سفر کبھی نہیں کیا۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم سہ پہر سوا چار بجے کراچی کے ماڑی پور ائرپورٹ پر اترے۔ یہیں ایک برس قبل قائدؒ ہوائی جہاز سے اترے تھے تو انتہائی پرامید تھے کہ وہ پاکستان کو

ایک عظیم قوم بنادیں گے۔تب انؒ کے استقبال کیلئے ہزاروں لوگ ائرپورٹ پر امڈ آئے تھے جن میں وزیر اور سفارتکار بھی شامل تھے مگر اس روز جیسا کہ پہلے ہی ہدایت کی جا چکی تھی، ایئرپورٹ پر کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ جب ہم طیارے سے باہر نکلے تو ہمارا استقبال کرنے والا پہلا شخص گورنر جنرل کا ملٹری سیکرٹری کرنل جیفرے نولز تھا۔قائد کو سٹریچر پر لٹا کر ایک ملٹری ایمبولینس تک لے جایا گیا جو انہیں گورنر ہاؤس لے جانے کے لئے ہوائی اڈے پر پہلے سے تیار کھڑی تھی۔ سسٹر ڈنہام اور میں قائدؒ کے ساتھ ایمبولینس میں بیٹھ گئیں۔ایمبولینس انتہائی آہستگی سے چل رہی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے دوسرے لوگ کاروں کے ذریعے ائرپورٹ سے روانہ ہوگئے۔ ڈاکٹر الٰہی بخش، ڈاکٹر مستری اور گورنر جنرل کا ملٹری سیکرٹری ایمبولینس کے پیچھے گورنر جنرل کی کیڈلک کار میں آرہے تھے۔

تقریباً چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ایمبولینس کے انجن نے ہچکی لی جیسے کھانس رہا ہو یا سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کے بعد اچانک بند ہوگیا۔تقریباً پانچ منٹ بعد میں ایمبولینس سے باہر نکلی تو مجھے بتایا گیا کہ ایمبولینس میں پٹرول ختم ہوگیا ہے۔ڈرائیور نے بے چینی کے عالم میں انجن کو دیکھنا بھالنا شروع کر دیا مگر وہ سٹارٹ نہ ہوسکا۔ جب میں دوبارہ ایمبولینس میں داخل ہوئی تو قائد کے ہاتھ میں آہستہ سے حرکت پیدا ہوئی اور انکی آنکھوں نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ میں نے نیچے جھک کر ان سے کہا: ”ایمبولینس کا انجن خراب ہوگیا ہے۔“

انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

کراچی میں عموماً تیز سمندری ہوائیں چلتی رہتی ہیں، جن کے باعث درجہ حرارت کم رہتا ہے اور گرم موسم کی شدت کم ہو جاتی ہے مگر اس روز سمندری ہوائیں نہیں چل رہی تھیں اور

گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ اس تکلیف دہ موسمی صورتحال پر مستزاد وہ بیسیوں مکھیاں تھیں جو ان کے چہرے کے اردگرد منڈلا رہی تھیں اور ان میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ ان کے حملے سے بچنے کیلئے اٹھا سکیں۔ مسز ڈنہام اور میں دوسری ایمبولینس کے آنے کے انتظار میں باری باری ان کے چہرے پر پنکھا جھلتی رہیں۔ ہر منٹ سوہانِ روح تھا۔ قائد ایک ایک کیڈلک کار میں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اتنی بڑی نہیں تھی کہ اس میں سٹریچر رکھا جا سکتا اور یوں ہم انتظار کرتے رہے اور امید پر کہ...........

اس جگہ کے آس پاس کی سینکڑوں جھگیاں تھیں جو اس بات سے بے خبر اپنے کام کاج میں مصروف تھے کہ ان کے قائدؒ جنہوں نے انہیں ایک الگ وطن لیکر دیا، ان کے عین درمیان ایک ایمبولینس میں بے یارومددگار پڑے ہیں جس کا پٹرول ختم ہو چکا ہے۔ کاریں اپنے راستے پر گامزن تھیں۔ بسیں اور ٹرک چیختے دھاڑتے اپنی اپنی منزلوں کی جانب رواں دواں تھے مگر ہم وہاں ایک ایسی غیر متحرک ایمبولینس میں کھڑے تھے جو ایک انچ آگے بڑھنے کے بھی قابل نہیں رہی تھی۔ اور اس کے اندر ایک قیمتی زندگی قطرہ قطرہ اور سانس بہ سانس اختتام کی جانب گامزن تھی۔

ہم نے وہاں ایک گھنٹے سے بھی زیادہ دیر تک انتظار کیا۔

میری پوری زندگی میں کوئی گھنٹہ اس ایک گھنٹے سے زیادہ دردناک نہیں گذرا۔ پھر ایک دسری ایمبولینس آئی۔ انہیں سٹریچر پر دوسری ایمبولینس میں منتقل کیا گیا اور یوں ہم بالآخر گورنر جنرل ہاؤس کے لئے روانہ ہوئے۔ جب انہیں نہایت آرام سے ان کے بستر پر لٹایا گیا تو ڈاکٹر الٰہی بخش کی گھڑی کے مطابق ہمیں ماڑی پور ائر پورٹ پر اترے دو گھنٹے سے بھی زائد وقت گذر چکا تھا۔ دو گھنٹے کوئٹہ سے کراچی آنے میں لگے اور دو گھنٹے ماڑی ائر پورٹ سے گورنر

جنرل ہاؤس تک جانے میں۔

ڈاکٹروں نے انکا معائنہ کیااور کہا کہ ہوائی سفراور ایمبولینس کے تکلیف دہ واقعہ کے باوجود ان کی صحت پر کوئی برے اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گئے اور ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس سے چلے گئے کہ وہ جلد ہی واپس آ جائیں گے، اب میں اپنے بھائی کے پاس تنہا تھی جو گہری نیند سو رہے تھے۔ میں نے وجدانی طور پر محسوس کیا کہ ان کی گہری نیند شمع کے اس آخری شعلے کی مانند ہے جو بجھنے سے پہلے زیادہ نمایاں اور بھرپور ہوا کرتا ہے۔ خاموشی کے اس عالم میں میرا دماغ ان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

''جن، کاش ایسا ہو سکے کہ میرا تمام خون نکال کر آپکے جسم میں داخل کر دیں تا کہ آپ زندہ رہ سکیں۔ کاش خدا میری زندگی کے تمام سال مجھ سے لے لے اور انہیں آپ کو دے دے تا کہ آپ ہماری قوم کی رہنمائی کرتے رہیں۔ اگر ایسا ہو سکے تو خداوند کریم میں تیری بیحد شکر گذار رہوں گی۔

وہ کسی خلل کے بغیر تقریباً دو گھنٹے تک گہری نیند سوتے رہے۔ پھر انہوں نے آنکھیں کھولیں، مجھے دیکھا اور سر اور آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا، انہوں نے بات کرنے کی آخری کوشش کی اور سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے:

''فاطی، خدا حافظ! لاالہٰ الا اللہ...... محمد...... الرسول...... اللہ'' اور ان کا سر آہستگی سے قدرے دائیں جانب کو ڈھلک گیا۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں چیختی چلاتی کمرے سے بھاگی: ''ڈاکٹر، جلدی کیجئے، میرا بھائی مر رہا ہے، ڈاکٹر کہاں ہیں؟''

ڈاکٹر چند منٹ میں پہنچ گئے اور انہوں نے قائداعظمؒ کا معائنہ کرنا اور انہیں انجکشن دینا

شروع کردیئے۔میں وہاں خاموش اور بے حس وحرکت کھڑی رہی۔ پھر میں نے دیکھا کہ انہوں نے ان کا پورا جسم سر سے پاؤں تک ایک سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔میں جانتی تھی کہ اس کا مطلب کیا ہے۔موت انہیں اس دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانے کیلئے آ چکی تھی۔ دوسری زندگی جو ابدی اور غیر فانی ہے۔

کرنل الٰہی بخش بوجھل قدموں کے ساتھ میری جانب بڑھے،اپنی دائیں ہتھیلی میرے بائیں کندھے پر رکھی اور چھوٹے سے بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ان آنسوؤں نے ایک ایسی زبان میں مجھ تک وہ مہلک خبر پہنچادی جس میں نہ الفاظ ہوتے ہیں اور نہ کوئی آواز۔میں نے اپنے آنسوؤں کو تلاش کیا مگر میرے اندر آنسوؤں کے تمام سوتے بھی شاید خشک ہو چکے تھے۔میں چیخنا، چلانا چاہتی تھی مگر میری آواز خاموشی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب چکی تھی۔میں خود کو گھسیٹتے ہوئے بمشکل تمام ان کے بستر تک پہنچی اور خود کو لکڑی کی بے جان گیلی شاخ کی طرح فرش پر گرادیا۔

ان کے انتقال کی خبر یقیناً چار دانگ عالم میں پھیل گئی ہوگی۔گورنر جنرل ہاؤس کے بڑے بڑے آہنی پھاٹک جن پر عام حالات میں سخت حفاظتی اقدامات کے ذریعے غیر متعلقہ لوگوں کو اندر داخل ہونے سے روک دیا جاتا تھا،آج پوری طرح کھلے ہوئے تھے اور ہر سمت سے لوگوں کے نہ ختم ہونے والے ریلے گورنر جنرل ہاؤس کے اندر بہتے چلے آرہے تھے۔

ان میں سے کچھ لوگ جلد ہی قائداعظمؒ کے کمرے میں پہنچ گئے جہاں وہ کسی خلل کے بغیر پڑے ایسی نیند سو رہے تھے جو بیداری سے بہت دور تھی۔میں وہاں بیٹھ گئی اور اپنے ماحول سے بے خبر میں اپنے اپ کو اپنے نا قابلِ تلافی نقصان میں مکمل طور پر گم کر چکی تھی۔

مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں وہاں کب تلک بیٹھی رہی اور اس سفید چادر کو گھورتی رہی جس کے

اندر میرا بھائی لیٹا پڑا تھا۔

بس مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک بوڑھی خاتون جسے میں نے اس سے پہلے تو نہ کبھی دیکھا تھا اور نہ میں اسے جانتی تھی، اس نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر چپکے سے میرے کان میں قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی:

انا للہ و انا الیہ راجعون۔

(ہم اللہ تعالیٰ کے لئے ہی ہیں اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔)